ترکش
جاوید اختر

جاوید اختر

ضابطہ

پاکستان میں جملہ حقوق : حوری نورانی

مکتبہ دانیال، وکٹوریہ چیمبرز ۲
عبداللہ ہارون روڈ، کراچی

بار اول — جون ۱۹۹۵ء
زیر اہتمام — صابر دت
قیمت — سو روپے
بیرون ملک — چھ امریکی ڈالر
طباعت — اسٹار ملٹی کلر آفسیٹ پرنٹرز
رزاق منزل، شاپ ۱۲، ماہم، بمبئی ۴۰۰۰۱۶

ساحر پبلشنگ ہاؤس

"پرچھائیاں" اے، بی، نائر روڈ، جیوجی بھائی بمبئی ۴۰۰۰۰۸ فون: ۴۲۰۳۸۳۷

اردو کتب خانہ پی کے
urdukutabkhanapk.blogspot

شبانہ کے نام

اردو کتب خانہ
URDUKUTABKHANAPK.BLOGSPOT

ترتیب

پیش لفظ

جاوید اختر ہندوستانی POPCULTURE کے ایک معمار ہیں اور موجودہ YUPPY CULTURE کے ایک درخشندہ نمائندے۔ ان کی فلموں کا متنازعہ فیہ دائرۂ اثر اتنا وسیع ہے کہ اس کے مقابلے میں ایک سنجیدہ ادبی کتاب کا ایک ہزار جلد کا اڈیشن بحر الکاہل میں تیرتے مٹر کے دانے کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن وہ اپنی خاندانی روایت کے مطابق چاول پر قل ھو اللہ بھی لکھ رہے ہیں لہٰذا میں اس مضمون میں ان کی اس آبائی کاریگری پر تھوڑی سی روشنی ڈالوں گی۔

جاوید کا نام لوگوں کے ذہن میں ایک جلوس یا کریڈٹ ٹائٹلز کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ مجاز۔ صفیہ۔ جاں نثار اختر۔ شبانہ۔ کیفی۔ زیادہ پڑھے لکھے حضرات مضطر خیر آبادی اور مولانا فضل حق خیر آبادی کو بھی یاد کرلیتے ہیں کہ موصوف کے اجداد تھے۔

جاوید کی والدہ قصبہ ردولی ضلع بارہ بنکی (اودھ) کی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ والد جاں نثار اختر قصبہ خیر آباد ضلع سیتاپور (اودھ) کے ایک مشہور علم دوست خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کو ایک درگاہ کی سجادہ نشینی بھی ورثے میں ملی تھی۔

جاننا چاہئے کہ شمالی ہند کی تہذیب کے یہ مراکز روہیل کھنڈ، اودھ اور

پورب دیس سے لیکر بہار تک پھیلے ہوئے تھے اور اپنے مدارس، کتب خانوں اور علم پرور خانوادوں کی وجہ سے مشہور تھے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اس عظیم الشان تمدن کی خاموش بے آواز تاراجی بغداد اور اندلس اور دلی اور لکھنؤ کی تباہیوں کے سلسلے کی آخری کڑی تھی کہ اس کے بعد برباد ہونے کے لئے اب کچھ باقی نہیں رہا۔ وہاں جو کھنڈر اب نظر آتے ہیں، یہ خوبصورت بارونق مکانات تھے۔ متمدن کنبے ان میں بستے تھے۔ یہ مقامات مسلم اشرافیہ کے گڑھ تھے آج سے ساٹھ پینسٹھ سال قبل چند نوجوان انہیں قصبات سے نعرہ زن نکلے۔ سجاد ظہیر، سبط حسن۔ مجاز۔ علی جواد زیدی۔ سردار جعفری۔ کیفی اعظمی۔ جاں نثار اختر وغیرہ ان سے ذرا سینئر۔ قصبہ ملیح آباد کے جوش شاعر انقلاب کہلائے۔ جس جماعت سے ان نوجوانوں نے ناتا جوڑا اس نے غیر دانشمندانہ نظریہ سازی کی مذہب پر حملے صحیح مارکسزم رہا ہو لیکن غلط سیاست تھی۔ انہوں نے مذہب پرست عوام کو اپنے خلاف بھڑکا دیا اور آزادی کے فوراً بعد جن سنگھ اور جماعت اسلامی کے لئے گلپوش راستہ ہموار کیا۔ شاباش۔ ایک وقت تھا کہ یہی عوام پارٹی کی قیادت کے منتظر تھے۔ آئے عشاق گئے وعدہ فردا لیکر۔ اب انہیں ڈھونڈ ــــ یہ جگجو کا مریڈ شاعر تھے، مجاز نے آہنگ کا انتساب اس طرح کیا تھا۔

فیض اور جذبی کے نام جو میرے دل و جگر ہیں
سردار اور مخدوم کے نام جو میرے دست و بازو ہیں

آج کا انفرادیت پرست تنہائی پسند شاعر ایسا انتساب نہیں کرے گا ــــ

یہ زیادہ تر MINOR KEY کے شاعر تھے۔ انہوں نے چند تابندہ نظمیں اردو کو دیں۔ یعنی۔ ع۔ لعل بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب۔

اُردو کے نوعمر طالب علم کے لئے وہ دور ایک LEGEND بن چکا ہے لیکن مجھے یاد ہے مثلاً ایک گھُپ اندھیری رات ایک صاحب لمبے بالوں والی ٹوپی اوڑھے (جیسی آجکل وی پی سنگھ اوڑھتے ہیں) انگلیوں میں جلتا سگریٹ، سبزے پر چلتے آرہے ہیں۔ والدہ کو اپنی کتاب "آہنگ" پیش کرتے ہیں یا گرمیوں کی ایک شام سفید براق کپڑے پہنے جوش صاحب گھوڑا گاڑی سے اُتر کے اندر آتے ہیں یا ایک چاندنی رات والدہ مجاز کو اپنی اوک لینڈ میں بٹھا کر دلکشا ایک دعوت میں لے جاتی ہیں جہاں وہ "اندھیری رات کا مسافر" پڑھتے ہیں۔ ایک مور ٹہلتا ہوا لان پر آجاتا ہے۔ چاند۔ مور اور شاعر۔ ایک ہائیکو۔

یا صفیہ آپا ——

دارالسراج ۔ دلال بہاری لال روڈ سے چہل قدمی کرتی ۲۱۔ فیض آباد روڈ والدہ سے ملنے آتی ہیں۔ دُبلی پتلی۔ سفید ساری پہنے۔ ہنستی مسکراتی۔

ان کی شادی کے بعد سُنا گیا کہ مجاز نے بہنوئی کو ایک عدد وھسکی کی بوتل تحفے میں دی۔ مری تعبیر میں مضمر ہے ایک صورت خرابی کی۔ اُردو شاعروں کی بلانوشی کا آج تک نفسیاتی اور عمرانی تجزیہ نہیں کیا گیا۔

مُلک آزاد ہوا۔

بھارت سرکار نے ہندی روسی بھائی بھائی کا نعرہ بلند کیا اور اپنے کمیونسٹوں کو جیلوں میں ڈالا۔ ترقی پسند شعراء نے پنڈت نہرو کے لئے کہا، مارے ساتھی، جانے نہ پائے۔ جہاں گیا ہے چیانگ کائی شیک، وہیں جائے گا نہرو بھائی۔

اردو پر یہ عجیب وقت پڑا۔ یوپی کے زمینداری ابولیشن میں ایک بات کی یہ تھی کہ

اُردو کلچر بھی اس کے ساتھ اُڑ گئی۔ لیکن پنجاب سے جو ہندو سکھ شرنارتھی فلم ساز آئے انہوں نے محض اُردو پڑھی تھی علاوہ ازیں پہلی بولتی فلم عالم آرا سے لیکر ۱۹۴۷ء تک فلموں کی زبان اُردو ہی تھی۔ مکالموں کی برجستگی اور روانی اور تہذیبی نفاست اور فلمی نغموں کی دل نشینی جو نیو تھیٹرز کے آرزو لکھنوی کی دین تھی اس کے بدولت آزادی کے بعد بھی گو اُردو سرکاری طور پر ختم کر دی گئی فلموں میں اس سخت جان خانہ بدوش زبان کا بول بالا رہا لیکن وہ ہندی کہلائی یعنی ایک پوری زبان کو ہائی جیک کر کے اس کا نام بدل دیا گیا، چنانچہ فلم انڈسٹری اُردو اہل قلم کے لئے ذریعۂ معاش بنی۔ ساحر بطور گیت کار بہت کامیاب رہے۔ کرشن چندر، بیدی، مجروح، سردار جعفری، مہندر ناتھ، راجہ مہدی علی خاں، شکیل بدایونی، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، شاہد لطیف، اختر الایمان سبھی بمبئی کی فلمی دنیا میں آباد ہو گئے، جاں نثار اختر کے نام بھوپال میں وارنٹ نکلا۔ انڈر گراونڈ تھے۔ بمبئی آئے۔ بمبئی میں وہ فلم انڈسٹری کے JUGGERNAUT جلوس میں شامل ہو گئے۔

صفیہ آپا نے بھوپال کے حمیدیہ کالج میں ملازمت کی اور نہایت بہادری سے اپنے دونوں بچوں کو پالا۔ شدید ذہنی اور جذباتی اور معاشی تکالیف کو بڑے حوصلے سے جھیلا اور اپنے خطوں کے روپ میں اپنے رنج والم اور عالی ہمتی کی دستاویز چھوڑ گئیں

"زیر لب" صفیہ اختر کے مکاتیب کے مجموعے کا نام ہے۔ اس کتاب کی ادبی حلقوں میں بہت دھوم مچی۔ یہ تعریف، توصیف بھی وقت کی عجب ستم ظریفی تھی۔ یہ خطوط بعض جگہ ایسے لرزہ خیز ہیں گویا موت کی کال کوٹھری سے لکھے گئے ہوں۔ لیکن ان کو پڑھ کر جاوید اختر کے اولیں ذہنی اور تربیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ ۱۹۵۰ء سے شروع ہوتے ہیں جب جاوید کی عمر پانچ سال کی تھی۔

صفیہ اپنے شوہر کو ساتھی کہہ کر مخاطب کرتی ہیں۔ وہ دونوں گویا دو سپاہی ہیں جو ایک خوش آئند مستقبل کے لئے لڑ رہے ہیں۔ جو سرخ سویرے کا مستقبل ہے۔

یہ بہت ہی اندوہناک تحریریں ہیں۔

نئی انقلابی عورت ہونے کے باوجود صفیہ اختر ایک بے انتہا پتی ورتا روایتی ہندوستانی بیوی۔ آدرش مہیلا۔ چرنوں کی داسی۔ خدائے مجازی کی کنیز معلوم ہوتی ہیں جو شوہر کی ایک نظر کرم اور خوشنودی حاصل کرنے کی خواہاں اور محتاج ہے۔ وہ علامہ راشد الخیری کی کسی مظلوم ہیروئین کی طرح بار بار اپنے بچوں کا واسطہ دیتی ہیں۔ جادو بہت یاد کر رہا ہے۔ سلمان تمہیں پکار رہا ہے۔ کب آؤ گے ساتھی۔

لیکن کامریڈ پتی دیو نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں۔

آزادی کے فوراً بعد فلمی صنعت جن اُردو ادیبوں کو راس آئی ان میں عصمت آپا بھی شامل تھیں۔ چنانچہ صفیہ اختر اپنے ایک خط میں پوچھتی ہیں ـــ "عصمت اپنے نئے فلیٹ میں منتقل ہو گئی ہوں گی۔ ان کی ریاست کا کیا حال ہے۔ جادو کی انقلاب پسندی اپنے عروج پر ہے۔ نور اللہ[1] صاحب سے انہوں نے باقاعدہ ایشیا، روس اور اسٹالن کی خوب باتیں کر ڈالیں۔ نور اللہ مجھ سے کہنے لگے کہ ایسے انقلابی بچوں کے ساتھ تو آپ کو بمبئی گورنمنٹ میں ملازمت ملنے کا کوئی امکان نہیں۔"

اس خط پر اٹھارہ نومبر ۱۹۵۰ء کی تاریخ پڑی ہے یعنی اس وقت جاوید کی عمر تقریباً چھ سال کی رہی ہو گی۔ ایسے بچوں کو ENFANT TERRIBLE کہا جاتا ہے۔

---

[1] بمبئی گورنمنٹ کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر آف ایجوکیشن۔

گھر کے انقلابی اور سیاسی ماحول سے متاثر ہونا بھی بچوں کے لئے ناگزیر تھا۔ ہند اور پاکستان میں اشتمالیوں کے لئے بڑی ہی آزمائش کا دور تھا۔ گرفتاریاں جاری تھیں۔ چھاپے پڑتے تھے اُردو ادب روز بروز زیادہ کٹر پنتھی ہوتا جا رہا تھا۔ ایک خاتون اُردو ادیب ایک جلسے میں کہنے لگیں آج ہمارے قلم سُرخ ہونے چاہئیں ہمارے افسانے سُرخ ہونے چاہئیں ہمارے ناول سُرخ ہونے چاہئیں ہماری نظمیں سُرخ ہونی چاہئیں ہماری غزلیں سُرخ ہونی چاہئیں مجاز سامعین میں موجود تھے کھڑے ہو کر فرمایا محترمہ کم از کم گلابی کی اجازت دے دیجئے) سردار، مجروح، کیفی شاید جیل جا چکے تھے یا جانے والے تھے حتیٰ کہ بھوپال میں اختر جمال کو ان کے چھ ماہ کے بچے کے ساتھ قید کر لیا گیا تھا۔

جاوید جب باپ کے ایک شعر پر تنقید کرتا ہے تو ماں فخر سے جاں نثار اختر کو لکھتی ہیں "وہ تم جیسے رومانی انقلاب پسندوں سے آگے ہو گا۔ وہ فرار کا قائل نہیں ہو سکتا۔ وہ ڈٹ کر لڑے گا اور تم سے آگے بڑھ جائے گا۔"

(۱۵ اپریل ۱۹۵۱ء کا خط)

اسکول میں بچوں نے قومی جھنڈے تیار کئے تو جاوید نے درانتی اور ہتھوڑے والا سُرخ پرچم بنایا۔ پھر وہ شوہر کو مزید اطلاع دیتی ہیں "جادو پاس ہی لیٹا ہوا مجھ سے افسانے لکھوا رہا ہے۔ بعض وقت ایسی ادبی گفتگو کرتا ہے کہ حیران ہو جاتی ہوں۔ ابھی ایک دو دن کی بات ہے باقی پڑھنے آئی تھی اسے میں جوش کے پانچ مجموعے پڑھا رہی تھی۔ آخری حصے میں زمیں مست فلک مست کی تکرار ہے۔ جادو ہنس کر بولا امی یہ تو ابّی کے جاگا قلم جاگی کتاب سے ملتا ہوا ہے۔ یہ عمر اور یہ ناقدانہ نگاہیں! دیکھو یہ جوہر یونہی ضائع ہوتا ہے یا اس کی آب و تاب سے چمکتا ہے۔"

افسوس کہ وہ اپنے لڑکوں کی غیر معمولی کامرانی دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہ پائیں۔

ایسے ہونہار بروا کو جو بعمر چھ سال اسٹالن زندہ باد کہہ رہا تھا، بڑے ہو کر نمبودری پد بننا چاہئے تھا مگر ماں کے بے وقت انتقال کے بعد آٹھ برس کی عمر سے جاوید نے یتیمی اور بے گھری کی تکلیفیں اٹھائیں۔ یہ چارلس ڈکنز کے کسی تھکے مصیبت زدہ کردار کی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ ایسے حالات میں وہ ماں کی توقعات پوری کرنے کے لئے ایک شعلۂ جوالا پارٹی ورکر بن سکتا تھا۔ مگر طرز تپاک اہل دنیا دیکھ کر اس کا دل اتنا جلا کہ اس نے لڑکپن میں ہی طے کر لیا کہ وہ خود دولتمند بنے گا۔ بچپن لکھنؤ (ننھیال) اور علی گڑھ (خالا حمیدہ سالم کے گھر) میں گزرا۔ بھوپال میں خاصی بے سر و سامانی کے عالم میں کاٹ گئے۔ کلاس میں کبھی جی نہیں لگا۔ البتہ مباحثوں اور بیت بازی میں برق تھے۔ تقریروں کے انعامی مقابلے جیتے۔ جب بمبئی پہونچے تو چھ دن بعد آدھی رات کو برستی بارش میں والد کے مکان سے نکلنا پڑا (والد عقد ثانی کر چکے تھے) فٹ پاتھ پر رہے۔ فاقے کئے۔ گزر اوقات کے لئے کارڈ شارپنگ کو بھی اپنا پیشہ بنایا۔ یہ ان کی نوعمری کے مزید ڈرامائی واقعات ہیں۔ محض اپنی ذہانت اور بذلہ سنجی کے بل بوتے پر دنیا سے لڑے جس ظرافت اور فن لطیفہ سازی و مجلس آرائی ماموں مجاز سے ملا تھا۔ زیر لب خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ انتہائی کٹھن زمانے میں صفیہ اختر کے سنس آف ہیومر نے بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔

جاوید اختر خود ساختہ کامیاب آدمی کی کلاسک مثال ہیں۔ ان کے چھوٹے بھائی بھی کم ذہین نہیں ہیں۔ وہ بھی اچھے شاعر ہیں۔ ان کا مجموعۂ کلام بعنوان "گو مگو" شائع ہو چکا ہے۔ بچپن میں دونوں بھائی اپنے دوستوں کے ساتھ "لڑائی لڑائی" کھیلتے۔ ایک دوست "امریکی شیطان" بنتا تھا۔ برادر خورد سلمان بحیثیت سائیگو انالسٹ اسی شیطانی ملک امریکہ

کے ایک متمول شہری ہیں۔ ع۔ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔

غالباً موسم سرما ۱۹۳۲ء میں مسلم یونیورسٹی کے اسٹریچی ہال میں روشندان کے راستے خالدہ ادیب خانم پر گلباری کی جارہی تھی (جو علی گڑھ کی ایک دل پذیر روایت ہے) اس کے بعد علامہ نے ایک تعارفی تقریر کی اور ایک نوجوان شاعر اسرار الحق مجاز نے ایک نظم نذر خالدہ پڑھی۔ والد مرحوم نے جلسے کے بعد احباب سے کہا یہ لڑکا آگے چل کر بڑی شہرت حاصل کرے گا۔ ۱۹۶۶ء میں بمبئی کے ایک سینما ہال میں جاں نثار اختر کی اپنی فلم بہو بیگم کے پریمیر پر واجدہ تبسم نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا "یہ اختر بھائی کا بیٹا جاوید ہے" تو کوئی وجہ نہ تھی کہ میں پیش گوئی کروں کہ یہ لڑکا آگے چل کر بہت شہرت حاصل کرے گا۔ مجھے تو وہ بچہ سا معلوم ہوا۔ اس نے کلائی میں رپٹیوں والا کڑا پہن رکھا تھا اور کچھ آشفتہ سر سا نظر آتا تھا بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کڑا کڑے وقت میں کام آنے والے ایک سکھ دوست کی نشانی تھا

چند سال بعد بطور اسکرپٹ رائٹر جاوید نے بے انتہا مقبولیت حاصل کی۔ اور جب سنجیدہ شاعری مجھے سُنائی تو مجھے تعجب نہیں ہوا کیونکہ مچھلی کے بچے کو تیرنا کون سکھلاتا ہے۔

جاوید ایک خوش گو خوش فکر قادر الکلام POST MODERN شاعر ہیں۔

تازہ کاری، گہرائی اور تنوع دیانت جذبات اور زندگی میں نئے مفاہیم کی تلاش ان کے اشعار کی خصوصیات ہیں۔

نازک خیالی اور فصیح البیانی ان کو ورثے میں ملی ہے۔ وہ بعض اوقات روایتی شعر کہہ لیں مگر بُری شاعری نہیں کر سکتے۔

ترکش غم جاناں اور غم دوراں کے تیروں سے پُر ہے۔ بچپن کی شیریں یا تلخ یادیں ہر ادیب یا شاعر کے لئے دریا ثابت ہوئی ہیں۔ جاوید اختر کی چند ایسی نظمیں جو انکے زخم خوردہ

جذبات اور احساس کی آئینہ دار ہیں شفاف آتم کتھا کے طور پر پڑھی جا سکتی ہیں

جب وہ کم عمر ہی تھا
اس نے یہ جان لیا تھا کہ اگر جینا ہے
بڑی چالاکی سے جینا ہوگا
آنکھ کی آخری حد تک ہے بساطِ ہستی
اور وہ معمولی سا اک مہرہ ہے
ایک اک خانہ بہت سوچ کے چلنا ہوگا

(ایک مہرے کا سفر)

بمبئی پہنچ کر اور باپ کے گھر سے نکلنے کے بعد میرے دن کے فاقے کی دلخراش یاد سہل ممتنع میں یوں ڈھلتی ہے ؎

میرے گھر میں چولہا تھا
روز کھانا پکتا تھا
... ...
ماں عجیب تھی میری
روز اپنے ہاتھوں سے
مجھ کو وہ کھلاتی تھی
کون سرد ہاتھوں سے
چھو رہا ہے چہرے کو
اک نوالا ہاتھی کا

اک نوالا گھوڑے کا

اک نوالا بھالو کا (بھوک)

یہ محض مضمون آفرینی نہیں۔ متواتر فاقہ کشی کے بعد لمسی اور سمعی التباس کا تجربہ عین ممکن ہے۔

صفیہ اختر کے خطوط کے سیاق و سباق میں دیکھئے تو اس نظم کا کرب اک تاثر دو چند ہو جاتا ہے۔ مائیں لاڈلے ننھے بچوں کو اسی طرح بہلا پھسلا کر کھلاتی ہیں۔

اک نوالا ہاتھی کا

اک نوالا گھوڑے کا

اک نوالا بھالو کا

مہرہ اپنی منزل مقصود پر پہونچتا ہے ؎

آسودگی سے دل کے سبھی داغ دھل گئے

لیکن وہ کیسے جائے جو شیشے میں بال ہے

غالباً یہ ماں کا غم ہے۔

جاوید نے اپنی فلموں میں ایک ستم رسیدہ ماں کا کردار بلا وجہ تخلیق نہیں کیا جس کی طرف سے ظالم سماج کو للکارنے والا ایک دیو قامت سرکش برہم نوجوان (امیتابھ بچن) اسکرین پر نمودار ہوا۔ اس بنیادی پلاٹ کے اجزائے ترکیبی میں POPULIST نسخے کی کیمیا پنہاں تھی۔ عوام نے اپنی تمام محرومیوں اور دکھوں کا بدلہ لینے والے اس کا کی اوتار کو دل و جان سے قبول کیا اور دھن برسایا ؎

غم بکتے ہیں

بازاروں میں غم کافی مہنگے بکتے ہیں

بھیجے کی دکان اگر چل جائے تو
جذبے کے گاہک
چھوٹے بڑے ہر غم کے کھلونے
منھ مانگی قیمت پہ خریدیں ....
(غم بکتے ہیں)

اپنی محبوبہ میں اپنی ماں دیکھیں
بن ماں کے لڑکوں کی فطرت ہوتی ہے

کہا جاتا ہے تنہائی فنکار کا مقدر ہے۔ میرا خیال ہے ایک پرفورمنگ آرٹسٹ (اداکار، رقاص، موسیقار) اتنا تنہا نہیں ہوتا کیوں کہ اس کے فن کے مظاہرے میں دوسروں کا اشتراک بھی شامل رہتا ہے۔

ادیب، شاعر، مصور بیچارے اکیلے سمجھے جاتے ہیں۔ اس تنہائی کی ایک MYSTIQUE بن گئی ہے اور اس کی مختلف پرچھائیاں ہیں۔ دو سال قبل اتوار کی ایک روشن خوشگوار صبح ٹرین مضافات کے پھولوں سے بھرے راستے سے گزرتی لندن جا رہی تھی جب حسب معمول ایک کوچہ گرد گویا کمپارٹمنٹ میں آیا اور گٹار پہ گانے لگا

BYE BYE HAPPINESS HELLO, LONELINESS

حسب معمول کسی نے اس کا نوٹس نہیں لیا۔
لیکن مجھے وہ سارے مطمئن خوش پوش، خاموش مسافر چند لمحوں کیلئے اس نغمے میں شریک سے معلوم ہوئے۔ جیسے تنہائی تنہائی سے بات کرتی ہے۔
گیت ختم کر کے وہ اگلے اسٹیشن پر اتر گیا۔ کسی نے اس کی ہیٹ میں سکے نہیں

تنہائی جاوید کا بھی ایک پسندیدہ مضمون ہے ؎

اس کے ایک ہاتھ میں ہے جیت اس کی

دوسرے ہاتھ میں تنہائی ہے

حصولِ مقاصد کے بعد اکیلے پن کا احساس ایک عالمگیر تجربہ ہے۔ بالخصوص مغرب میں یہ تنہائی بعض اوقات ہلاکت خیز ثابت ہوتی ہے۔

دنیائے دوں سے حسب دلخواہ دام وصول کرنے کے بعد راوی کو چین لکھنا چاہئے تھا۔ مگر ایسا ہوتا نہیں۔ فتنۂ انفرادیت پسندی پھر بھی غیر مطمئن رہتی ہے۔ ایک پُر آسائش زندگی گزارتے ہوئے شاعر اپنے لڑکپن کی محرومیوں اور کلفتوں کو بھی محبت سے یاد کرتا ہے۔

اس معاملے میں جاوید اختر زہرہ نگاہ اختر الایمان اور افتخار عارف کے ہمنوا ہیں

ذہن و دل آج بھوکے مرتے ہیں

ان دنوں ہم نے فاقے جھیلے تھے

وہ کمرہ یاد آتا ہے جو بُرے وقت میں ان کی جائے پناہ تھا۔ کھُردرے شفیق باپ کی طرح مشکل سے کھلنے والا دروازہ، گستاخ منہ پھٹ آئینہ، بے ہنگم بوڑھی اناسی الماری، ذہانت سے بھری مسکراہٹ جیسا دریچہ، اس پر جھکی بیل کی سبز سرگوشی، سنجیدہ استانیوں جیسی کتابیں۔ وہ کمرہ پیارے ماں کی طرح ڈانٹتا تھا، یہ کیا عادت ہے۔ جلتی دوپہر میں مارے مارے گھومتے ہو تم۔

میں اب جس گھر میں رہتا ہوں

بہت ہی خوبصورت ہے

مگر اکثر یہاں خاموش بیٹھا یاد کرتا ہوں

وہ کمرہ بات کرتا تھا (وہ کمرہ یاد آتا ہے)

ایک یہ گھر جس گھر میں میرا ساز و ساماں رہتا ہے

ایک وہ گھر جس میں میری بوڑھی نانی رہتی تھیں

یہ شعر پڑھ کر مجھے لکھنؤ کے دارالسراج کا سادہ گھریلو ماحول یاد آ گیا۔ بظاہر یہ جاوید اختر کی بے ساختہ آپ بیتی ہے مگر بوڑھی نانی ایک علامت بھی ہیں — قدیم اقدار کی محافظ، بے غرض، بے لوث، محبت کی پتلی، صابر و شاکر، بھولی۔

گھر سے چلا تو دل کے سوا پاس کچھ نہ تھا

کیا مجھ سے کھو گیا ہے مجھے کیا ملال ہے

اس شعر میں مجھے ایک قلندرانہ کیفیت اور خیرآباد کی خانقہی موسیقی کی گونج سنائی دی۔ گو خود شاعر کو اس گونج سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ ایک حقیقت پسند، عملی، شہری آدمی ہیں۔ ان کا کوئی ذہنی یا جذباتی رابطہ اپنے والدین کے اس نیم دیہی نیم خانقہی فیوڈل معاشرے سے بھی نہیں ہے۔ ان کے ماں باپ خود اس معاشرے کو مسترد کر چکے تھے لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ جاوید نے غیر شعوری طور پر اردو کلچر کے ذریعے اس خانقہی تہذیب کی اہم ترین خصوصیات یعنی سیکولر اور انسان دوست اقدار کا اثر بھی قبول کیا ہے۔ ان کا ویلیو سسٹم صحیح ہے۔ اور وہ بنیادی طور سے ترقی پسند ہیں۔ وہ عورت کی بھی بہت عزت کرتے ہیں اور اس کی ہمسری اور برابری کے قائل ہیں۔

اپنی بیٹی زویا کو مخاطب کر کے کہتے ہیں —

یہ اُن لوگوں کا رستہ ہے
جو خود اپنے تک جاتے ہیں
اپنے آپ کو جو پاتے ہیں
تم اِس رستے پر ہی چلنا
مجھے پتا ہے
یہ رستہ آسان نہیں ہے
لیکن مجھ کو یہ غم بھی ہے
تم کو اب تک
کیوں اپنی پہچان نہیں ہے

(دورایا)

بعض اوقات آج اور کل کے ادب میں حیرت انگیز مماثلت ملتی ہے۔

جو سزا چاہے عدالت دے دے
فیصلہ سُننے کو تیار ہوں میں
ہاں گنہ گار ہوں میں (جُرم اور سزا)

ان اشعار میں مجاز کا لہجہ جھلکتا ہے۔

جاوید کے "شاہکار" میں اور میری آوارگی" کا جوشِ بیاں اور صوت و آہنگ کی طغیانی مضطر خیر آبادی کے اس شعر کی یاد دلاتی ہے جو متعدد صفحات پر محیط ہے تو یہ اُردو کی جادو بیانی ہے جو پلٹ پلٹ کے دکھاتی ہے ایک ہی تصویر ——
جاوید اپنے عہد کے شعری مزاج کے نمائندے ہیں۔ اور ہر اچھا شاعر

دوسرے اچھے شاعر کی یاد دلا سکتا ہے۔

اونچی عمارتوں سے مکاں میرا گھر گیا
کچھ لوگ میرے حصے کا سورج بھی کھا گئے

یہاں جاوید محمد علوی اور ندا فاضلی کے ہمزبان ہیں۔

سب ہوائیں لے گیا میرے سمندر کی کوئی
اور مجھ کو ایک کشتی بادبانی دے گیا

یہاں عزیز بانو وفا ساحل پر کھڑی ملتی ہیں۔

"وقت" میں جوگی نامے کی روایت کی دھیمی سی بازگشت ہے۔ حال ہی میں میں نے یہ نظم سن کر جاوید سے کہا کہ یہ تو کچھ برگساں کے "آنِ واحد" کا سا چکر معلوم ہوتا ہے کہنے لگے آپ بھول گئیں پندرہ سولہ سال قبل آپ ہی نے تو مجھ سے برگساں کے فلسفۂ وقت کا ذکر کیا تھا۔ اس کے بعد میں نے اسی مسئلے پر بہت سوچا۔ سوچ اور تجسس انسان کو خوب سے خوب تر کی طرف لے جا سکتا ہے۔

کیوں ہیں کب تک ہیں کس کی خاطر ہیں
بڑے سنجیدہ مسئلے ہیں ہم

بہرہ غم ذات سے غم کائنات کی طرف سفر کرتا ہے۔ جاوید اختر مدرِ ٹریزا سے کہتے ہیں ؎

مجھ کو تیری عظمت سے انکار نہیں ہے (لیکن)
تو نے کبھی یہ کیوں نہیں پوچھا
کس نے ان بدحالوں کو بدحال کیا ہے

پچھلی نسل کا SELF-RIGHTEOUS پروگریسو شاعر خود ہی یہ جواب نہ دیتا۔

میں ٹھہرا خود غرض

بس اک اپنی ہی خاطر جینے والا

میں تجھ سے کس منہ سے پوچھوں ......

پوچھوں گا تو مجھ پر بھی وہ ذمے داری آ جائے گی

جس سے میں بچتا آیا ہوں

بہتر ہے خاموش رہوں میں (مدر ٹریزا)

آہستی پردہ روس اور مغرب کے درمیان سے اُٹھ کر ہم اہلِ جنوب ایشیا کی عقلوں پر پڑ گیا۔ لہٰذا ہم ایک دوسرے سے مزید بدگمان اور متنفر ہوتے جا رہے ہیں۔

چنانچہ جب جاوید اختر کہیں کہ

آؤ اب ہم اس کے بھی ٹکڑے کر لیں

ڈھاکہ راولپنڈی اور دِلّی کا چاند

تو راولپنڈی کا انٹلکچوئل پوچھے گا کیوں صاحب آپ چاند کو سالم رکھنے پر کیوں مصر ہیں؟

اُنکے کئے تاریخ اُردو ادب یوں لکھی جاتی ہے" دلی دکنی پاک و ہند میں سترہویں صدی میں پیدا ہوئے "۔ ہمارے کئے مغل ہسٹری سیاسی اکھاڑہ بن چکی ہے۔

" پربت پہ پھول کھل رہے ہیں بیٹھا ہے غار میں درندہ "

یہ ایک کامیاب تصویری شعر ہے۔

فسادات پر ان گنت نظمیں لکھی جا چکی ہیں۔ ایک RITUAL ہے جو

ہر خونریزی کے بعد دہرایا جاتا ہے۔ یہ نظمیں شاعر کی بےبسی پر نوحہ زن ہیں وہ اگر پارلیمنٹ میں بھی پہونچ جائے تو کچھ نہیں کرسکتا۔ کچھ عرصے بعد سیاسی پارٹیاں دوسرا فساد بپا کروادیتی ہیں اور مزید دلدوز نظمیں۔ سردار جعفری، کیفی اعظمی، راہی معصوم رضا، جاوید اختر سب نے فسادات پر بہت پُر اثر نظمیں لکھی ہیں۔ ادبی روایت کا تسلسل اسے کہتے ہیں۔

یہ نظریہ کہ ہنگامی حالات کا ادب زندہ نہیں رہتا صحیح نہیں۔ ہمارے شہر آشوب آج کی داستان معلوم ہوتے ہیں۔ چند مثالیں اور لیجئے۔ ڈبلیو۔ بی۔ ایٹس کا ایسٹر ۱۹۱۶ء منٹو کے افسانے۔ وارث شاہ کے متعلق امرتا پریتم کی پنجابی نظم کلام فیض۔

اب جو بھی لکھا جائے گا زیادہ تر کرائسس کا ادب ہوگا۔ صورتِ حال محض ہنگامی نہیں رہی۔ تاریخ الٹ گئی ہے۔ ہندو ورلڈ ویو اور اسلامک ورلڈ ویو پر دھواں دھار تقریریں اور سیمینار ہو رہے ہیں۔ اور ووٹ ڈالے جا رہے ہیں۔

تیز ترک گامزن ـــ تیز ترک گامزن ـــ

جب ابنِ آدم کی سائیکی پوری طرح بدل جائے گی اور GENETIC ENGINEERING سے نہیں بلکہ ذہن شوئی کے ذریعے ایسا ہوگا۔ اس وقت بہت جلد آنے والی صدی کے آغاز ہی میں افراد اور فرقوں اور قوموں کی جمالیات، طرزِ فکر اور ذرائع ابلاغ دوسری شکلیں اختیار کرلیں گے۔ انیسویں صدی کے آخر میں رومان، جمال پرستی اور غنائیت کا مغربی ادب میں فروغ ہوا تھا۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد کے روحانی ویرانے میں ایلیٹ نے ویسٹ لینڈ لکھی۔ پروگریسو تحریک نے اُمید پرستی کا چلن عام کیا۔ ہیروشیما کے بعد سے انسان کے دل میں اجتماعی خودکشی اور

خواہش مرگ کچھ خود جاگی ہے کچھ دنیا کے POWER BROKERS نے جگائی ہے۔ نوجوانوں کے اندر تنہائی اور تشدد پسندی بھری ہوئی ہے۔ وہ HARD ROCK اور HARD METAL کے ذریعے باہر آرہی ہے اور ہماری فلموں میں بھی دھوم دھڑکے سے نمودار ہو چکی ہے۔ لیکن اب زوال پرست مغرب کے مقابلے میں سوشلسٹ بلاک کے صالح، نیک خو نوجوانوں کی مثال پیش نہیں کی جا سکتی کیونکہ وہ نوجوان بھی سوشلزم کے خاتمے کے بعد آناً فاناً جرائم پیشہ بن گئے۔

بیٹھا ہے غار میں درندہ

ایک ناقابل فراموش چند سکنڈ کا منظر میں نے ٹیلی ویژن پر دیکھا تھا اسرائیلی بمباری کے بعد ایک فلسطینی عورت اپنے گمشدہ بیٹے کا فوٹوگراف مجمع میں ہر ایک کو دکھلاتی پھر رہی تھی اور کوئی اس کی نہیں سن رہا تھا اور ایک ننھا سا بچہ اسی بھیڑ میں اپنے ماں باپ کو ڈھونڈ رہا تھا۔

— تو بوڑھی نانی جس دالان میں، آنگن میں یا نیم کے پیڑ کے نیچے بیٹھی ہیں۔ تسبیح پھیر رہی ہیں یا رامائن کا پاٹھ کر رہی ہیں۔ پل کی پل میں وہ گھر ہندو مسلم یا کاسٹ وار میں پھونک دیا جائے گا۔ اس سلسلے میں ہم خود کفیل ہیں اور ہمیں غیر ملکی دشمن کی بمباری کی ضرورت نہیں ہے

"پربت پہ پھول کھل رہے ہیں بیٹھا ہے غار میں درندہ"

یہاں بھی پھول کھلے ہیں اور باہر کی دنیا میں بھی اور سوشلسٹ ممالک میں پھول کھلے ہم نے بچشم خود ملاحظہ کئے تھے اور حسین خوش منظر بوزنیہ میں جیتے جاگتے انسان شکاری کتوں کے سامنے ڈالے گئے۔ اور یوکرین سے لیکر وسط ایشیاء

تک کمیونزم کا ڈھکن اُٹھتے ہی قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا۔

یہ حسن بن صباح اور راسپوٹین اور گوئبلز کا وقت ہے ؎

اپنی اپنی تاریکی کو لوگ اُجالا کہتے ہیں
تاریکی کے نام لکھوں تو قومیں فرقے ذات لکھوں
غم نہیں لکھوں کیا میں غم کو جشن لکھوں کیا ماتم کو
جو دیکھے ہیں میں نے جنازے کیا انکو بارات لکھوں (غزل)

میں قتل تو ہو گیا تمھاری گلی میں لیکن
مرے لہو سے تمھاری دیوار گل رہی ہے
نہ چلنے پاتے تھے جس کے چولہے بھی ہر سویرے
سُنا ہے کل رات سے وہ بستی بھی جل رہی ہے (غزل)

"فساد کے بعد" "میں اور مری آوارگی" "ایک مہرے کا سفر" "بھوک" "وہ کمرہ یاد آتا ہے" "شکست" اور "وقت" لکھ کر جاوید اختر نے اُردو کی عظیم صنفی میں اپنا مقام محفوظ کر لیا ہے۔

اُردو شاعری کے نیاگرا آبشار پر اَن گنت پھواروں سے جو قوس و قزح بنتی ہے اس کے رنگوں کے بہت سے پرتو ہیں اور ان میں جاوید کا پرتو بھی شامل ہو چکا ہے۔

یہ جو زلف تیری اُلجھ گئی وہ جو تھی کبھی تیری دھج گئی
میں تجھے سنواروں گا زندگی مرے ہاتھ میں یہ اُمور دے

چند ماہ قبل میں دلی کے مشہور آرٹسٹ فیروز کے نگار خانے میں گئی جو ذاکر نگر کے دولتمند GHETTO میں ایک حیرت انگیز خوشگوار اور پُر فضا جمالستان کی صورت میں استادہ ہے۔ استاد فیروز جہانگیر کے مصوّر استاد منصور کی اولاد میں سے ہیں۔ گویا ان کا اسٹوڈیو بھی آنِ واحد میں شامل ہے۔ وقت کی چند منجمد تصاویر بھی وہاں دیکھیں ــــ جمنا کی ریتی پر بیٹھے کا وہ میلہ جہاں مرزا غالب نے پہلی بار اس ڈومنی کو ناچتے دیکھا جس کا نام آج تک کوئی محقق دریافت نہیں کر پایا۔ آج سے ساٹھ ستر برس قبل دلی کی ایک محفل جس میں اس وقت کی نامور ڈانسر نوشابہ مصروفِ رقص ہیں۔

استاد فیروز بھی گلہری کی دُم سے خود موقلم بناتے ہیں جس طرح ان کے اجداد بناتے تھے اور مختصر ترین مینا تور تیار کرتے ہیں۔

ان کا پتہ مجھے دلّی مرحوم کی ایک اور باقیماندہ یادگار یعنی سور گباشی لالہ مہیشور دیال نے اپنی اچانک وفات سے چند روز قبل ہی بتلایا تھا۔

میں نے جناب فیروز سے پوچھا ــــ آپ اتنے اطمینان سے یہ تصویریں بنا رہے ہیں جبکہ باہر کلچر کا مطلب ہی بدل گیا ہے؟ انہوں نے نہایت دلجمعی سے جواب دیا ــــ وہ اپنا کام کریں۔ ہم اپنا کام کئے جائیں گے۔

اس امید پرست مثبت رویے میں تہذیب اور انسانیت کی بقا مضمر ہے۔

اس وقت جبکہ مصنوعی سیّارے ذہن شوئی اور دروغ گوئی کے مقصد سے خریدے جا رہے ہیں انسانیت کش نظریات کے خلاف سنگھرش میں جادید جن کے "ترکش" میں رنگ و چنگ حرف و صوت سب موجود ہیں اپنی ماں کی یہ

توقع پوری کرسکتے ہیں کہ وہ فرار کے قائل نہیں ہوں گے اور ڈٹ کر لڑیں گے ۔

جب سے کسی نے
کرلی ہے سُورج کی چوری
آؤ
چل کے سورج ڈھونڈیں
اور نہ ملے تو
کرن کرن پھر جمع کریں ہم
اور اک سورج نیا بنائیں (صبح کی گوری)

ترکش جدید اُردو شاعری کی ایک اہم دستاویز ہے ۔ جب تک جاوید کی دوسری کتاب چھپے ——
—— میں سمجھتی ہوں اتنا دیباچہ کافی ہے ۔

قرۃ العین حیدر

......اپنی زندگی میں تم نے کیا کیا...؟ کسی سے سچے دل سے پیار کیا؟ کسی دوست کو نیک صلاح دی؟ کسی دشمن کے بیٹے کو محبت کی نظر سے دیکھا؟ جہاں اندھیرا تھا وہاں کبھی روشنی کی کرن لے گئے؟ جتنی دیر تک جیئے، اس جینے کا مطلب کیا تھا..؟......

کرشن چندر

"میرا آنگن۔ میرا پیڑ"

میرا آنگن
کتنا کشادہ کتنا بڑا تھا
جس میں
میرے سارے کھیل
سما جاتے تھے
اور آنگن کے آگے تھا وہ پیڑ کہ جو مجھ سے کافی اُونچا تھا
لیکن
مجھ کو اس کا یقیں تھا

جب میں بڑا ہو جاؤں گا
اس پیڑ کی پھننگی بھی چھو لوں گا

برسوں بعد
میں گھر لوٹا ہوں
دیکھ رہا ہوں
یہ آنگن
کتنا چھوٹا ہے
پیڑ مگر پہلے سے بھی تھوڑا اونچا ہے

ہمارے شوق کی یہ انتہا تھی
قدم رکھا کہ منزل راستا تھی

بچھڑ کے ڈار سے بن بن پھرا وہ
ہرن کو اپنی کستوری سزا تھی

کبھی جو خواب تھا وہ پا لیا ہے
مگر جو کھو گئی وہ چیز کیا تھی

میں بچپن میں کھلونے توڑتا تھا
مرے انجام کی وہ ابتدا تھی

محبت مر گئی مجھ کو بھی غم ہے
مرے اچھے دنوں کی آشنا تھی

جسے پھولوں میں وہ ہو جائے سونا
تجھے دیکھا تو جانا بد دعا تھی

مریضِ خواب کو تو اب شفا ہے
مگر دنیا بڑی کڑوی دوا تھی

وہ کمرہ یاد آتا ہے

میں جب بھی
زندگی کی چلچلاتی دھوپ میں تپ کر
میں جب بھی
دوسروں کے اور اپنے جھوٹ سے تھک کر
میں سب سے لڑ کے خود سے ہار کے
جب بھی اُس اک کمرے میں جاتا تھا
وہ ہلکے اور گہرے کتھئی رنگوں کا اک کمرہ
وہ بے حد مہرباں کمرہ

جو اپنی نرم مٹھی میں مجھے ایسے چھپا لیتا تھا
جیسے کوئی ماں
بچے کو آنچل میں چھپا لے
پیار سے ڈانٹے

یہ کیا عادت ہے
جلتی دوپہریں مارے مارے گھومتے ہو تم
وہ کمرہ یاد آتا ہے

دبیز اور خاصا بھاری
کچھ ذرا مشکل سے کھلنے والا وہ شیشم کا دروازہ
کہ جیسے کوئی اکھڑ باپ
اپنے کھردرے سینے میں
شفقت کے سمندر کو چھپائے ہو

وہ کرسی
اور اس کے ساتھ وہ جڑواں بہن اسکی
وہ دونوں
دوست تھیں میری
وہ اک گستاخ منہ پھٹ آئینہ

جو دل کا اچھا تھا
وہ بے ہنگم سی الماری
جو کونے میں کھڑی
اک بوڑھی انا کی طرح
آئینے کو تنبیہہ کرتی تھی

وہ اک گلدان
ننھا سا
بہت شیطان
ان دونوں پہ ہنستا تھا

دریچہ
یا ذہانت سے بھری اک مسکراہٹ
اور دریچے پر جھکی وہ بیل
کوئی سبز سرگوشی
کتابیں
طاق میں اور شیلف پر
سنجیدہ استانی بنی بیٹھیں
مگر سب منتظر اس بات کی

میں اُن سے کچھ پوچھوں

سرہانے

نیند کا ساتھی

تھکن کا چارہ گر

وہ نرم دِل تکیہ

یں جس کی گود میں سر رکھ کے

چھت کو دیکھتا تھا

چھت کی کڑیوں میں

نجانے کتنے افسانوں کی کڑیاں تھیں

وہ چھوٹی میز پر

اور سامنے دیوار پہ

آویزاں تصویریں

مجھے اپنائیت سے اور یقیں سے دیکھتی تھیں

مسکراتی تھیں

انھیں شک بھی نہیں تھا

ایک دن

میں انکو ایسے چھوڑ جاؤں گا

میں اک دن یوں بھی جاؤں گا
کہ پھر واپس نہ آؤں گا

میں اب جس گھر میں رہتا ہوں
بہت ہی خوبصورت ہے
مگر اکثر یہاں خاموش بیٹھا یاد کرتا ہوں
وہ کمرہ بات کرتا تھا

جنگل میں گھومتا ہے پہروں، فکرِ شکار میں درندہ
یا اپنے زخم چاٹتا ہے، تنہا کچھار میں درندہ

باتوں میں دوستی کا اَمرت، سینے میں زہر نفرتوں کا
پربت پہ پھول کھل رہے ہیں، بیٹھا ہے غار میں درندہ

ذہنی یگانگت کے آگے، تھیں خواہشیں خجل بدن کی
چٹان پہ بیٹھا چاند تا کے جیسے کنوار میں درندہ

گاؤں سے شہر آنے والے، آئے، ندی پہ جیسے پیاسے
تھا منتظر انہیں کا کب سے، اک روزگار میں درندہ

مذہب نہ جنگ نے سیاست، جانے نہ ذات پات کو بھی
اپنی درندگی کے آگے، ہے کس شمار میں درندہ

کون سا شعر سُناؤں میں تمہیں، سوچتا ہوں
نیا مُبہم ہے بہت اور پُرانا مشکل

بھوک

آنکھ کھل گئی میری
ہو گیا میں پھر زندہ
پیٹ کے اندھیروں سے
ذہن کے دھندلکوں تک
ایک سانپ کے جیسا
رینگتا خیال آیا
آج تیسرا دن ہے — آج تیسرا دن ہے
اک عجیب خاموشی

منجمد بے کمرے میں
ایک فرش اور اک چھت
اور چار دیواریں
مجھ سے بے تعلق سب
سب بڑے تماشائی
سامنے کی کھڑکی سے
تیز دھوپ کی کرنیں
آ رہی ہیں بستر پر
چبھ رہی ہیں چہرے میں
اس قدر نکیلی ہیں
جیسے رشتے داروں کے
طنز میری غربت پر
آنکھ کھل گئی میری
آج کھوکھلا ہوں میں
صرف خول باقی ہے
آج میرے بستر میں

لیٹا ہے مرا ڈھانچہ
اپنی مردہ آنکھوں سے
دیکھتا ہے کمرے کو
آج تیسرا دن ہے
آج تیسرا دن ہے

دوپہر کی گرمی میں
بے ارادہ قدموں سے
اک سڑک پہ چلتا ہوں
تنگ سی سڑک پر ہیں
دونوں سمت دوکانیں
خالی خالی آنکھوں سے
ہر دکان کا تختہ
صرف دیکھ سکتا ہوں
اب پڑھا نہیں جاتا
لوگ آتے جاتے ہیں
پاس سے گزرتے ہیں

پھر بھی کتنے دھندلے ہیں
سب ہیں جیسے بے چہرہ
شور ان دکانوں کا
راہ چلتی اک گالی
ریڈیو کی آوازیں
دور کی صدائیں ہیں
آرہی ہیں میلوں سے
جو بھی سُن رہا ہوں میں
جو بھی دیکھتا ہوں میں
خواب جیسا لگتا ہے
ہے بھی اور نہیں بھی ہے
دوپہر کی گرمی میں
بے ارادہ قدموں سے
اک سڑک پہ چلتا ہوں
سامنے کے نکڑ پر
نل دکھائی دیتا ہے
سخت کیوں ہے یہ پانی

کیوں گلے میں چبھتا ہے
میرے پیٹ میں جیسے
گھونٹ ایک لگتا ہے
آرہا ہے چکر سا
جسم پر پسینہ ہے
اب سکت نہیں باقی
آج تیسرا دن ہے
آج تیسرا دن ہے

ہر طرف اندھیرا ہے
گھاٹ پر اکیلا ہوں
سیڑھیاں ہیں پتھر کی
سیڑھیوں پہ لیٹا ہوں
اب میں اٹھ نہیں سکتا
آسماں کو تکتا ہوں
آسماں کی تھالی میں
چاند ایک روٹی ہے

جھک رہی ہیں اب پلکیں
ڈوبتا ہے یہ منظر
ہے زمین گردش میں
میرے گھر میں چولھا تھا
روز کھانا پکتا تھا
روٹیاں سنہری ہیں
گرم گرم یہ کھانا
کھل نہیں رہی آنکھیں
کیا میں مرنے والا ہوں
ماں عجیب تھی میری
روز اپنے ہاتھوں سے
مجھ کو وہ کھلاتی تھی
کون سرد ہاتھوں سے
چھو رہا ہے چہرے کو
اک نوالا ہاتھی کا
اک نوالا گھوڑے کا
اک نوالا بھالو کا

موت ہے کہ بیہوشی
جو بھی ہے غنیمت ہے
موت ہے کہ بیہوشی
جو بھی ہے غنیمت ہے
آج تیسرا دن تھا۔ آج تیسرا دن تھا

گِن گِن کے بجتے ہاتھ مرا کھردرا ہوا
جاتی رہی وہ لمس کی نرمی، بُرا ہوا

ہم تو بچپن میں بھی اکیلے تھے
صرف دل کی گلی میں کھیلے تھے

اک طرف مورچے تھے، پلکوں کے
اک طرف آنسوؤں کے ریلے تھے

تھیں سبھی حسرتیں دکانوں پر
زندگی کے عجیب میلے تھے

خودکشی کیا دُکھوں کا حل بنتی
موت کے اپنے سو جھمیلے تھے

ذہن و دل آج بھوکے مرتے ہیں
اُن دنوں ہم نے فاقے جھیلے تھے

اونچی عمارتوں سے مکاں میرا گھِر گیا
کچھ لوگ میرے حصّے کا سورج بھی کھا گئے

بنجارہ

میں بنجارہ
وقت کے کتنے شہروں سے گزرا ہوں
لیکن
وقت کے اس اک شہر سے جاتے جاتے مڑ کے دیکھ رہا ہوں
سوچ رہا ہوں
تم سے میرا یہ ناتا بھی ٹوٹ رہا ہے
تم نے مجھ کو چھوڑا تھا جس شہر میں آ کر
وقت کا اب وہ شہر بھی مجھ سے چھوٹ رہا ہے

مجھ کو بِدا کرنے آئے ہیں
اس نگری کے سارے باسی

وہ سارے دن
جن کے کندھے پر سوتی ہے
اب بھی تمھاری زلف کی خوشبو
سارے لمحے
جن کے ماتھے پر ہے روشن
اب بھی تمھارے لمس کا ٹیکا
نم آنکھوں سے
گم سم مجھ کو دیکھ رہے ہیں
مجھ کو اِن کے دکھ کا پتا ہے
ان کو میرے غم کی خبر ہے
لیکن مجھ کو حکم سفر ہے
جانا ہوگا
وقت کے اگلے شہر مجھے اب جانا ہوگا

وقت کے اگلے شہر کے سارے باشندے

سب دن سب راتیں
جو تم سے ناواقف ہوں گے
وہ کب میری بات سنیں گے
مجھ سے کہیں گے
جاؤ اپنی راہ لو راہی
ہم کو کتنے کام پڑے ہیں
جو بیتی سو بیت گئی
اب وہ باتیں کیوں دہراتے ہو
کندھے پر یہ جھولی رکھے
کیوں پھرتے ہو کیا پاتے ہو
میں بے چارہ
اک بنجارہ
آوارہ پھرتے پھرتے جب تھک جاؤں گا
تنہائی کے ٹیلے پر جا کر بیٹھوں گا
پھر جیسے پہچان کے مجھ کو
اک بنجارہ جان کے مجھ کو
وقت کے اگلے شہر کے سارے ننھے منے بھولے لمحے

ننگے پاؤں

دوڑے دوڑے بھاگے بھاگے آجائیں گے
مجھ کو گھیر کے بیٹھیں گے
اور مجھ سے کہیں گے
کیوں بنجارے
تم تو وقت کے کتنے شہروں سے گزرے ہو
اُن شہروں کی کوئی کہانی ہمیں سناؤ
اُن سے کہوں گا
ننھّے لمحو!
ایک تھی رانی
سن کے کہانی
سارے ننھے لمحے
غمگیں ہو کر مجھ سے یہ پوچھیں گے
تم کیوں ان کے شہر نہ آئیں
لیکن ان کو بہلا لوں گا
ان سے کہوں گا
یہ مت پوچھو

آنکھیں موندو

اور یہ سوچو
تم ہوتیں تو کیسا ہوتا
تم یہ کہتیں
تم وہ کہتیں
تم اِس بات پہ حیراں ہوتیں
تم اُس بات پہ کتنی ہنستیں
تم ہوتیں تو ایسا ہوتا
تم ہوتیں تو ویسا ہوتا

دھیرے دھیرے
میرے سارے ننھے لمحے
سو جائیں گے

اور میں

پھر ہولے سے اٹھ کر
اپنی یادوں کی جھولی کندھے پر رکھ کر
پھر چل دوں گا

وقت کے اگلے شہر کی جانب
ننھے لمحوں کو سمجھانے
بھولے لمحوں کو بہلانے
یہی کہانی پھر دہرانے
تم ہوتیں تو ایسا ہوتا
تم ہوتیں تو ویسا ہوتا

خوش شکل بھی ہے وہ یہ الگ بات ہے مگر
ہم کو ذہین لوگ ہمیشہ عزیز تھے

دل میں مہک رہے ہیں کسی آرزو کے پھول
پلکوں پہ کھلنے والے ہیں شاید لہُو کے پھول

اب تک ہے کوئی بات مجھے یاد حرف حرف
اب تک میں چن رہا ہوں کسی گفتگو کے پھول

کلیاں چٹک رہی تھیں کہ آواز تھی کوئی
اب تک سماعتوں میں ہیں اک خوش گلو کے پھول

میرے لہو کا رنگ ہے ہر نوکِ خار پر
صحرا میں ہر طرف ہیں مری جستجو کے پھول

دیوانے کل جو لوگ تھے پھولوں کے عشق میں
اب اُن کے دامنوں میں بھرے ہیں رفو کے پھول

ہم کو اُٹھنا تو مُنھ اندھیرے تھا
لیکن اک خواب ہم کو گھیرے تھا

سوکھی ٹہنی تنہا چڑیا پھیکا چاند
آنکھوں کے صحرا میں ایک نمی کا چاند

اُس ماتھے کو چومے کتنے دن بیتے
جس ماتھے کی خاطر تھا اک ٹیکا چاند

پہلے تُو لگتی تھی کتنی بیگانہ
کتنا مبہم ہوتا ہے پہلی کا چاند

کم ہو کیسے ان خوشیوں سے تیرا غم
لہروں میں کب بہتا ہے ندی کا چاند

آؤ اب ہم اسکے بھی ٹکڑے کریں
ڈھاکہ راولپنڈی اور دلّی کا چاند

سب کا خوشی سے فاصلہ ایک قدم ہے
ہر گھر میں بس ایک ہی کمرہ کم ہے

ایک مہرے کا سفر

جب وہ کم عمر ہی تھا
اس نے یہ جان لیا تھا کہ اگر جینا ہے
بڑی چالاکی سے جینا ہوگا
آنکھ کی آخری حد تک ہے بساطِ ہستی
اور وہ معمولی سا اک مہرہ ہے
ایک اک خانہ بہت سوچ کے چلنا ہوگا
بازی آسان نہیں تھی اسکی
دور تک چاروں طرف پھیلے تھے

مہرے

جلّاد

نہایت سفاک

سخت بے رحم

بہت ہی چالاک

اپنے قبضے میں لئے

پوری بساط

اسکے حصے میں فقط مات لئے

وہ جدھر جاتا

اسے ملتا تھا

ہر نیا خانہ نئی گھات لئے

وہ مگر بچتا رہا

چلتا رہا

ایک گھر

دوسرا گھر

تیسرا گھر

پاس آیا کبھی اوروں کے

کبھی دور ہوا
وہ مگر بچتا رہا
چلتا رہا
گو کہ معمولی سا مہرہ تھا مگر جیت گیا
یوں وہ اک روز بڑا مہرہ بنا
اب وہ محفوظ ہے اک خانے میں
اتنا محفوظ کہ دشمن تو الگ
دوست بھی پاس نہیں آ سکتے
اُس کے اک ہاتھ میں ہے جیت اُس کی
دوسرے ہاتھ میں تنہائی ہے

"مدر تھریسا"

اے ماں تھریسا
مجھ کو تیری عظمت سے انکار نہیں ہے
جانے کتنے
سوکھے لب اور ویراں آنکھیں
جانے کتنے
تھکے بدن اور زخمی روحیں
کوڑا گھر میں روٹی کا اک ٹکڑا ڈھونڈتے ننگے بچے
فٹ پاتھوں پر گلتے سڑتے بڈھے کوڑھی

جانے کتنے
بے گھر، بے در، بے کس انساں
جانے کتنے
ٹوٹے، کچلے، بے بس انساں
تیری چھاؤں میں
جینے کی ہمت پاتے ہیں
اِن کو اپنے ہونے کی جو سزا ملی ہے
اُس ہونے کی سزا سے
تھوڑی سی ہی سہی
مہلت پاتے ہیں
تیرا لمس مسیحا ہے
اور تیرا کرم ہے ایک سمندر
جس کا کوئی پار نہیں ہے
اے ماں دھرتیا
مجھ کو تیری عظمت سے انکار نہیں ہے

میں ٹھہرا خود غرض

بس اک اپنی ہی خاطر جینے والا
میں تجھ سے کس منھ سے پوچھوں
تو نے کبھی یہ کیوں نہیں پوچھا
کس نے ان بدحالوں کو بدحال کیا ہے
تو نے کبھی یہ کیوں نہیں سوچا
کونسی طاقت
انسانوں سے جینے کا حق چھین کے
ان کو فٹ پاتھوں اور کوڑا گھروں تک پہنچاتی ہے
تو نے کبھی یہ کیوں نہیں دیکھا
وہی نظامِ زر
جس نے ان بھوکوں سے روٹی چھینی ہے
ترے کہنے پر
بھوکوں کے آگے
کچھ ٹکڑے ڈال رہا ہے
تو نے کبھی یہ کیوں نہیں چاہا
ننگے بچے
بڈھے کوڑھی

بے بس انساں

اس دنیا سے

اپنے جینے کا حق مانگیں

جینے کی خیرات نہ مانگیں

ایسا کیوں ہے

اک جانب مظلوم سے تجھکو ہمدردی ہے

دوسری جانب

ظالم سے بھی عار نہیں ہے

لیکن سچ ہے

ایسی باتیں

میں تجھ سے کس منہ سے پوچھوں

پوچھوں گا تو

مجھ پر بھی وہ ذمّے داری آجائے گی

جس سے میں بچتا آیا ہوں

بہتر ہے خاموش رہوں میں

اور اگر کچھ کہنا ہو تو

یہی کہوں میں

اے ماں تجھ پہ
مجھ کو تیری عظمت سے انکار نہیں ہے

اپنی وجہِ بربادی سُنئے تو مزے کی ہے
زندگی سے یوں کھیلے جیسے دوسرے کی ہے

فساد سے پہلے

آج اس شہر میں
ہر شخص ہراساں کیوں ہے
چہرے
کیوں فق ہیں
گلی کوچوں میں
کس لیے چلتی ہے
خاموش و سراسیمہ ہوا
آشنا آنکھوں پہ بھی

اجنبیت کی یہ باریک سی جھلی کیوں ہے

شہر
سناٹے کی زنجیروں میں
جکڑا ہوا ملزم سا نظر آتا ہے
اِکا دُکا
کوئی رہگیر گزرجاتا ہے
خوف کی گرد سے
کیوں دھندلا ہے سارا منظر
شام کی روٹی کمانے کے لئے
گھر سے نکلے تو ہیں کچھ لوگ مگر
مڑکے کیوں دیکھتے ہیں گھر کی طرف
آج
بازار میں بھی
جانا پہچانا سا وہ شور نہیں
سب یوں چلتے ہیں کہ جیسے
یہ زمیں کانچ کی ہے
ہر نظر

نظروں سے کتراتی ہے

بات
کھُل کر نہیں ہو پاتی ہے
سانس روکے ہوئے
ہر چیز نظر آتی ہے
آج
یہ شہر اک سہمے ہوئے بچے کی طرح
اپنی پرچھائیں سے بھی ڈرتا ہے
جنتری دیکھو
مجھے لگتا ہے
آج تیوہار کوئی ہے شاید

وہ ڈھل رہا ہے تو یہ بھی رنگت بدل رہی ہے
زمین سورج کی انگلیوں سے پھسل رہی ہے

جو مجھ کو زندہ جلا رہے ہیں وہ بے خبر ہیں
کہ میری زنجیر دھیرے دھیرے پگھل رہی ہے

میں قتل تو ہو گیا تمھاری گلی میں لیکن
مرے لہو سے تمھاری دیوار گل رہی ہے

نہ جلنے پاتے تھے جس کے چولھے بھی ہر سویرے
سنا ہے کل رات سے وہ بستی بھی جل رہی ہے

میں جانتا ہوں کہ خامشی میں ہی مصلحت ہے
مگر یہی مصلحت مرے دل کو کھل رہی ہے

کبھی تو انسان زندگی کی کرے گا عزت
یہ ایک امید آج بھی دل میں پل رہی ہے

فساد کے بعد

گہرا سناٹا ہے
کچھ مکانوں سے خاموش اٹھتا ہوا
گاڑھا کالا دھواں
میل دل میں لیے
ہر طرف دور تک پھیلتا جاتا ہے
گہرا سناٹا ہے
لاش کی طرح بے جان ہے راستا
ایک ٹوٹا ہوا ٹھیلا

الٹا پڑا

اپنے پہیے ہوا میں اٹھائے ہوئے
آسمانوں کو حیرت سے تکتا ہے
جیسے کہ جو بھی ہوا
اس کا اب تک یقیں اس کو آیا نہیں
گھڑا سنّاٹا ہے
ایک اجڑی دکاں
چیخ کے بعد منہ
جو کھلا کا کھلا رہ گیا
اپنے ٹوٹے کواڑوں سے وہ
دور تک پھیلے
چوڑی کے ٹکڑوں کو
حسرت زدہ نظروں سے دیکھتی ہے
کہ کل تک یہی شیشے
اس پوپلے منہ میں
سو رنگ کے دانت تھے
گہرا سنّاٹا ہے

گہرے سناٹے نے اپنے منظر سے یوں بات کی

سن لے اجڑی دکاں

اے سلگتے مکاں

ٹوٹے ٹھیلے

تمہیں بس نہیں ہو اکیلے

یہاں اور بھی ہیں

جو غارت ہوئے ہیں

ہم اِن کا بھی ماتم کریں گے

مگر پہلے اُن کو تو رولیں

کہ جو لُوٹنے آئے تھے

اور خود لُٹ گئے

کیا لُٹا

اس کی اُن کو خبر ہی نہیں

کم نظر ہیں

کہ صدیوں کی تہذیب پر

اُن بچاروں کی کوئی نظر ہی نہیں

خواب کے گاؤں میں پلے ہیں ہم
پانی چھلنی میں لے چلے ہیں ہم

چھاچھ پھونکیں کہ اپنے بچپن میں
دودھ سے کس طرح جلے ہیں ہم

خود ہیں اپنے سفر کی دشواری
اپنے پیروں کے آبلے ہیں ہم

تُو تو مت کہہ ہمیں بُرا دنیا
تو نے ڈھالا ہے اور ڈھلے ہیں ہم

کیوں ہیں کب تک ہیں کس کی خاطر ہیں
بڑے سنجیدہ مسئلے ہیں ہم

اس شہر میں جینے کے انداز نرالے ہیں
ہونٹوں پہ لطیفے ہیں آواز میں چھالے ہیں

غم ہوتے ہیں جہاں ذہانت ہوتی ہے
دنیا میں ہر شے کی قیمت ہوتی ہے

اکثر وہ کہتے ہیں وہ بس میرے ہیں
اکثر کیوں کہتے ہیں حیرت ہوتی ہے

تب ہم دونوں وقت چرا کر لاتے تھے
اب ملتے ہیں جب بھی فرصت ہوتی ہے

اپنی محبوبہ میں اپنی ماں دیکھیں
بن ماں کے لڑکوں کی فطرت ہوتی ہے

اک کشتی میں ایک قدم ہی رکھتے ہیں
کچھ لوگوں کی ایسی عادت ہوتی ہے

گلی میں شور تھا ماتم تھا اور ہوتا کیا
میں گھر میں تھا مگر اس غل میں کوئی سوتا کیا

ہم سے دلچسپ کبھی سچے نہیں ہوتے ہیں
اچھے لگتے ہیں مگر اچھے نہیں ہوتے ہیں

چاند میں بڑھیا بزرگوں میں خدا کو دیکھیں
بھولے اب اتنے تو یہ بچے نہیں ہوتے ہیں

کوئی یاد آئے ہمیں کوئی ہمیں یاد کرے
اور سب ہوتا ہے یہ قصے نہیں ہوتے ہیں

کوئی منزل ہو بہت دور ہی ہوتی ہے مگر
راستے واپسی کے لیے نہیں ہوتے ہیں

آج تاریخ تو دہراتی ہے خود کو لیکن
اسمیں بہتر جو تھے وہ حصے نہیں ہوتے ہیں

آج کی دنیا میں جینے کا قرینہ سمجھو
جو ملیں پیار سے ان لوگوں کو زینہ سمجھو

معمّہ

ہم دونوں جو حرف تھے
ہم اک روز ملے
اک لفظ بنا
اور ہم نے اک معنی پائے
پھر جانے کیا ہم پر گزری
اور اب یوں ہے
تم اک حرف ہو
اک خانے میں

میں اک حرف ہوں
اک خانے میں
بیچ میں
کتنے لمحوں کے خانے خالی ہیں
بھر سے کوئی لفظ بنے
اور ہم دونوں اک معنی پائیں
ایسا ہو سکتا ہے
لیکن
سوچنا ہوگا
ان خالی خانوں میں ہم کو بھرنا کیا ہے

اُلجھن

کروڑوں چہرے
اور اُن کے پیچھے
کروڑوں چہرے
یہ راستے ہیں کہ بھڑ کے چھتّے
زمین جسموں سے ڈھک گئی ہے
قدم تو کیا تل بھی دھرنے کی اب جگہ نہیں ہے
یہ دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں
کہ اب جہاں ہوں

وہیں بسمٹ کے کھڑا رہوں میں
مگر کروں کیا
کہ جانتا ہوں
کہ رک گیا تو
جو بھیڑ پیچھے سے آ رہی ہے
وہ مجھ کو پیروں تلے کچل دیگی پیس دے گی
تو اب جو چلتا ہوں میں
تو خود سے کٹ کر اپنے پیروں میں آ رہا ہے
کسی کا سینہ
کسی کا بازو
کسی کا چہرہ
چلوں
تو اوروں پہ ظلم ڈھاؤں
رکوں
تو اوروں کے ظلم جھیلوں
ضمیر
تجھ کو تو ناز ہے اپنی منصفی پر

ذرا سنوں تو
کہ آج کیا تیرا فیصلہ ہے

کم سے کم اُس کو دیکھ لیتے تھے
اب کے سیلاب میں وہ پُل بھی گیا

جہنمی

میں اکثر سوچتا ہوں
ذہن کی تاریک گلیوں میں
دہکتا اور پگھلتا
دھیرے دھیرے آگے بڑھتا
غم کا یہ لاوا
اگر چاہوں
تو رک سکتا ہے
میرے دل کی بھٹی کہاں پر رکھا یہ انگارا

اگر چاہوں
تو بجھ سکتا ہے
لیکن
پھر خیال آتا ہے
میرے سارے رشتوں میں
پڑی ساری دراروں سے
گزر کے آنے والی برف سے ٹھنڈی ہوا
اور میری ہر پہچان پر سردی کا یہ موسم
کہیں ایسا نہ ہو
اِس جسم کو اس رُوح کو ہی منجمد کر دے
میں اکثر سوچتا ہوں
ذہن کی تاریک گلیوں میں
دہکتا اور پگھلتا
دھیرے دھیرے آگے بڑھتا
غم کا یہ لاوا
اذیّت ہے
مگر پھر بھی غنیمت ہے

اِسی سے رُوح میں گرمی
بدن میں یہ حرارت ہے
یہ غم میری ضرورت ہے
میں اپنے غم سے زندہ ہوں

اے سفر اتنا رائیگاں تو نہ جا
نہ ہو منزل کہیں تو پہونچا دے

بیمار کی رات

درد بے رحم ہے
جلّاد ہے درد
درد کچھ کہتا نہیں
سنتا نہیں
درد بس ہوتا ہے
درد کا مارا ہوا
روندا ہوا
جسم تو اب ہار گیا

رُوح ضدّی ہے
لڑے جاتی ہے
ہانپتی
کانپتی
گھبرائی ہوئی
درد کے زور سے
تھرّائی ہوئی
جسم سے لپٹی ہے
کہتی ہے
نہیں چھوڑوں گی

موت
چوکھٹ پہ کھڑی ہے کب سے
صبر سے دیکھ رہی ہے اُس کو
آج کی رات
نہ جانے کیا ہو

یہ تسلی ہے کہ ہیں ناشاد سب
میں اکیلا ہی نہیں، برباد سب

سب کی خاطر ہیں یہاں سب اجنبی
اور کہنے کو ہیں گھر آباد سب

بھول کے سب رنجشیں سب ایک ہیں
میں بتاؤں سب کو ہوگا یاد سب

سب کو دعوائے وفا سب کو یقیں
اِس اداکاری میں ہیں استاد سب

شہر کے حاکم کا یہ فرمان ہے
قید میں کہلائیں گے آزاد سب

چار لفظوں میں کہو جو بھی کہو
اُس کو کب فرصت سنے فریاد سب

تلخیاں کیسے نہ ہوں اشعار میں
ہم پہ جو گزری ہمیں ہے یاد سب

میں پا سکا نہ کبھی اِس خلش سے چھٹکارا
وہ مجھ سے جیت بھی سکتا تھا جانے کیوں ہارا

برس کے کھُل گئے آنسو نِتھر گئی ہے فضا
چمک رہا ہے سرِ شام درد کا تارا

کسی کی آنکھ سے ٹپکا تھا اِک امانت ہے
مری ہتھیلی پہ رکھا ہوا یہ انگارا

جو پَر سمیٹے تو اک شاخ بھی نہیں پائی
کھُلے تھے پَر تو مرا آسمان تھا سارا

وہ سانپ چھوڑ دے ڈَسنا یہ میں بھی کہتا ہوں
مگر نہ چھوڑیں گے لوگ اُس کو گر نہ پھُنکارا

لو دیکھ لو، یہ عشق ہے، یہ وصل ہے، یہ ہجر
اب لَوٹ چلیں آؤ، بہت کام پڑا ہے

میں خود بھی سوچتا ہوں یہ کیا میرا حال ہے
جس کا جواب چاہیئے وہ کیا سوال ہے

گھر سے چلا تو دل کے سوا پاس کچھ نہ تھا
کیا مجھ سے کھو گیا ہے مجھے کیا ملال ہے

آسودگی سے دل کے سبھی داغ دھل گئے
لیکن وہ کیسے جائے جو شیشے میں بال ہے

بے دست و پا ہوں آج تو الزام کس کو دوں
کل میں نے ہی بُنا تھا یہ میرا ہی جال ہے

پھر کوئی خواب دیکھوں، کوئی آرزو کروں
اب اے دلِ تباہ ترا کیا خیال ہے

وہ شکل پگھلی تو ہر شے میں ڈھل گئی جیسے
عجیب بات ہوئی ہے اُسے بُھلانے میں

شکست

سیاہ ٹیلے پہ تنہا کھڑا وہ سنتا ہے
فضا میں گونجتی اپنی شکست کی آواز
نگہ کے سامنے
میدانِ کارزارِ جہاں
جہاں پہ خوابوں کے پامال اور زخمی بدن
پڑے ہیں بکھرے ہوئے چاروں سمت
بے ترتیب
بہت سے مر چکے

اور جن کی سانس چلتی ہے
سسک رہے ہیں
کسی لمحہ مرنے والے ہیں
یہ اُس کے خواب
یہ اُسکی سپاہ
اُس کے جری
چلے تھے گھر سے تو کتنی زمین جیتی تھی
جھکائے کتنے تھے مغرور بادشاہوں کے سر
فصیلیں ٹوٹ کے گر کے سلام کرتی تھیں
پہنچنا شرط تھی
خود آکے آپ کھلتے تھے
تمام قلعوں کے دروازے
سارے محلوں کے در
نظر میں اُن دنوں منظر بہت سجیلا تھا
زمیں سنہری تھی
اور آسمان نیلا تھا
مگر تھی خوابوں کے لشکر میں کس کو اس کی خبر

ہر ایک قصے کا اک اختتام ہوتا ہے
ہزار لکھ دے کوئی فتح ذرّے ذرّے پر
مگر شکست کا بھی اک مقام ہوتا ہے
افق پہ چیونٹیاں رینگیں
غنیم فوجوں نے
وہ دیکھتا ہے
کہ تازہ کمک بلائی ہے
شکاری نکلے ہیں اسکے شکار کی خاطر
زمین کہتی ہے
یہ نرغہ تنگ ہونے کو ہے
ہوائیں کہتی ہیں
اب واپسی کا موسم ہے
پہ واپسی کا کہاں راستہ بنایا تھا
جب آ رہا تھا کہاں یہ خیال آیا تھا
پلٹ کے دیکھتا ہے
سامنے سمندر ہے
کنارے کچھ بھی نہیں

صرف ایک راکھ کا ڈھیر
یہ اُس کی کشتی ہے
کل اُس نے خود جلائی تھی

قریب آنے لگیں قاتلوں کی آوازیں
سیاہ ٹیلے پہ تنہا کھڑا وہ سُنتا ہے

وہ نہر ایک قصہ ہے دنیا کے واسطے
فرہاد نے تراشا تھا خود کو چٹان پر

سچ یہ ہے بیکار ہیں غم ہوتا ہے
جو چاہا تھا دنیا میں کم ہوتا ہے

ڈھلتا سورج پھیلا جنگل رستہ گم
ہم سے پوچھو کیسا عالم ہوتا ہے

غیروں کو کب فرصت ہے دکھ دینے کی
جب ہوتا ہے کوئی ہمدم ہوتا ہے

زخم تو ہم نے اِن آنکھوں سے دیکھے ہیں
لوگوں سے سنتے ہیں مرہم ہوتا ہے

ذہن کی شاخوں پر اشعار آجاتے ہیں
جب تیری یادوں کا موسم ہوتا ہے

مرے وجود سے یوں بے خبر ہے وہ جیسے
وہ ایک دھوپ گھڑی ہے میں رات کا پل ہوں

شہر کے دکاں دارو! کاروبارِ الفت میں سود کیا زیاں کیا ہے تم نہ جان پاؤ گے
دل کے دام کتنے ہیں خواب کتنے مہنگے ہیں اور نقدِ جاں کیا ہے تم نہ جان پاؤ گے

کوئی کیسے ملتا ہے پھول کیسے کھلتا ہے آنکھ کیسے جھکتی ہے سانس کیسے رکتی ہے
کیسے رہ نکلتی ہے کیسے بات چلتی ہے شوق کی زباں کیا ہے تم نہ جان پاؤ گے

وصل کا سکوں کیا ہے ہجر کا جنوں کیا ہے حسن کا فسوں کیا ہے عشق کے دروں کیا ہے
تم مریضِ دانائی مصلحت کے شیدائی راہِ گمرہاں کیا ہے تم نہ جان پاؤ گے

زخم کیسے پھلتے ہیں داغ کیسے جلتے ہیں درد کیسے ہوتا ہے کوئی کیسے روتا ہے
اشک کیا ہے نالے کیا دشت کیا ہے چھالے کیا آہ کیا فغاں کیا ہے تم نہ جان پاؤ گے

نامراد دل کیسے صبح و شام کرتے ہیں کیسے زندہ رہتے ہیں اور کیسے مرتے ہیں
تم کو کب نظر آئی غم زدوں کی تنہائی زیست بے اماں کیا ہے تم نہ جان پاؤ گے

جانتا ہوں میں تم کو ذوقِ شاعری بھی ہے شخصیت سجانے میں اک یہ ماہری بھی ہے
پھر بھی حرف چنتے ہو صرف لفظ سنتے ہو ان کے درمیاں کیا ہے تم نہ جان پاؤ گے

جسم دمکتا ۔ زلف گھنیری ۔ رنگیں لب ۔ آنکھیں جادو
سنگِ مرمر ۔ اودا بادل ۔ سرخ شفق ۔ حیراں آہو

بھکشو وانی ۔ پیاسا پانی ۔ دریا ساگر ۔ جل گاگر
گلشن خوشبو ۔ کوئل کوکو ۔ مستی دارو ۔ میں اور تو

بانبی ناگن ۔ چھایا آنگن ۔ گھنگھرو چھن چھن ۔ آشا من
آنکھیں کاجل ۔ پربت بادل ۔ وہ زلفیں اور یہ بازو

راتیں بھیگی ۔ سانسیں دہکی ۔ نظریں بہکی ۔ رُت لہکی
سپن سلونا ۔ پریم کھلونا ۔ پھول بچھونا ۔ وہ پہلو

تم سے دوری ۔ یہ مجبوری ۔ زخم کاری ۔ بیداری
تنہا راتیں ۔ سپنے کاتیں ۔ خود سے باتیں ۔ میری خو

اُن چراغوں میں تیل ہی کم تھا
کیوں گلہ پھر ہمیں ہوا سے رہے

ہجر

کوئی شعر کہوں
یا دنیا کے کسی موضوع پر
میں کوئی نیا مضمون پڑھوں
یا کوئی انوکھی بات سنوں
کوئی بات
جو ہنسنے والی ہو
کوئی فقرہ

جو دلچسپ لگے
یا کوئی خیال اچھوتا سا
یا کہیں ملے
کوئی منظر
جو حیراں کر دے
کوئی لمحہ
جو دل کو چھو جائے
میں اپنے ذہن کے گوشوں میں
ان سب کو سنبھال کے رکھتا ہوں
اور سوچتا ہوں
جب ملو گے
تم کو سناؤں گا

دشواری

میں بھول جاؤں تمہیں
اب یہی مناسب ہے
مگر بھلانا بھی چاہوں تو کس طرح بھولوں
کہ تم تو پھر بھی حقیقت ہو
کوئی خواب نہیں
یہاں تو دل کا یہ عالم ہے کیا کہوں
کمبخت!
بھلا نہ پایا یہ وہ سلسلہ
جو تھا ہی نہیں

وہ اک خیال
جو آواز تک گیا ہی نہیں
وہ ایک بات
جو میں کہہ نہیں سکا تم سے
وہ ایک ربط
جو ہم میں کبھی رہا ہی نہیں
مجھے ہے یاد وہ سب
جو کبھی ہوا ہی نہیں

میرے کچھ پل مجھ کو دیدو باقی سارے دن لوگو
تم جیسا جیسا کہتے ہو سب ویسا ویسا ہوگا

آثارِ قدیمہ

ایک پتھّر کی ادھوری مُورت
چند تانبے کے پُرانے سکّے
کالی چاندی کے عجب سے زیور
اور کئی کانسے کے ٹوٹے برتن
ایک صحرا میں ملے
زیرِ زمیں
لوگ کہتے ہیں کہ صدیوں پہلے
آج صحرا ہے جہاں

وہیں اک شہر ہوا کرتا تھا
اور مجھ کو یہ خیال آتا ہے
کسی تقریب
کسی محفل میں
سامنا تجھ سے مرا آج بھی ہو جاتا ہے
ایک لمحے کو
بس اک پل کے لئے
جسم کی آنچ
اچٹتی سی نظر
سرخ بندیا کی دمک
سرسراہٹ ترے ملبوس کی
بالوں کی مہک
بے خیالی میں کبھی
لمس کا ننھا سا پھول
اور پھر دور تک وہی صحرا
وہی صحرا کہ جہاں
کبھی اک شہر ہوا کرتا تھا

پھرتے ہیں کب سے دربدر اب اس نگر اب اُس نگر اک دوسرے کے ہمسفر میں اور مری آوارگی
ناآشنا ہر رہگزر نامہرباں ہر اک نظر جائیں تو اب جائیں کدھر میں اور مری آوارگی

ہم بھی کبھی آباد تھے ایسے کہاں برباد تھے بے فکر تھے آزاد تھے مسرور تھے دلشاد تھے
وہ چال ایسی چل گیا ہم بجھ گئے دل جل گیا نکلے جلا کے اپنا گھر میں اور مری آوارگی

جینا بہت آسان تھا اک شخص کا احسان تھا ہم کو بھی اک ارمان تھا جو خواب کا سامان تھا
اب خواب ہے نے آرزو ارمان ہے نے جستجو یوں بھی چلو خوش ہیں مگر میں اور مری آوارگی

وہ ماہ وش وہ ماہ رو، وہ ماہ کامل ہو بہو تھیں جس کی باتیں کو بکو اس سے عجب تھی گفتگو
پھر یوں ہوا وہ کھو گئی تو مجھ کو ضد سی ہو گئی لائیں گے اسکو ڈھونڈ کر میں اور مری آوارگی

یہ دل ہی تھا جو سہہ گیا وہ بات ایسی کہہ گیا کہنے کو پھر کیا رہ گیا اشکوں کا دریا بہہ گیا
جب کہہ کے وہ دلبر گیا تیرے لئے میں مر گیا روتے ہیں اسکو رات بھر میں اور مری آوارگی

اب غم اٹھائیں کس لئے آنسو بہائیں کس لئے یہ دل جلائیں کس لئے یوں جاں گنوائیں کس لئے
پیشہ نہ ہو جس کا ستم ڈھونڈیں گے اب ایسا صنم ہوں گے کہیں تو کارگر میں اور مری آوارگی

آثار ہیں سب کھوٹ کے امکان ہیں سب چوٹ کے گھر بند ہیں سب گوٹ کے اب ختم ہیں سب ٹوٹکے
قسمت کا سب یہ پھیر ہے اندھیر ہے ایسے ہوئے ہیں بے اثر میں اور مری آوارگی

جب ہمدم و ہمراز تھا تب اور ہی انداز تھا اب سوز ہے تب ساز تھا اب شرم ہے تب ناز تھا
اب مجھ سے ہو تو ہو بھی کیا ہے ساتھ وہ تو وہ بھی کیا اک بے ہنر اک بے ثمر میں اور مری آوارگی

غم بکتے ہیں

غم بکتے ہیں
بازاروں میں
غم کافی مہنگے بکتے ہیں
لہجے کی دکان اگر چل جائے تو
جذبے کے گاہک
چھوٹے بڑے ہر غم کے کھلونے
منہ مانگی قیمت پہ خریدیں
میں نے

ہمیشہ اپنے غم اچھے داموں بیچے ہیں
لیکن
جو غم مجھ کو آج ملا ہے
کسی دکاں پر رکھنے کے قابل ہی نہیں ہے
پہلی بار میں شرمندہ ہوں
یہ غم بیچ نہیں پاؤں گا

میری بنیادوں میں کوئی ٹیڑھ تھی
اپنی دیواروں کو کیا الزام دوں

آؤ اور نہ سوچو

آؤ

اور نہ سوچو
سوچ کے کیا پاؤ گے
جتنا بھی سمجھے ہو
اُتنا پچھتائے ہو
جتنا بھی سمجھو گے
اُتنا پچھتاؤ گے
آؤ

اور نہ سوچو
سوچ کے کیا پاؤ گے
تم احساس کی جس منزل پر اب پہنچے ہو
وہ میری دیکھی بھالی ہے
جانے بھی دو
اس کا کب تک سوگ منانا
یہ دنیا
اندر سے اتنی کیوں کالی ہے
آؤ
کچھ اب جینے کا سامان کریں ہم
سچ کے ہاتھوں
ہم نے جو مشکل پائی ہے
جھوٹ کے ہاتھوں
وہ مشکل آسان کریں ہم
تم میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھو
پھر میں تم سے
ساری جھوٹی قسمیں کھاؤں

پھر تم وہ ساری جھوٹی باتیں دہراؤ
جو سب کو اچھی لگتی ہیں

جیسے
وفا کرنے کی باتیں
جینے کی مرنے کی باتیں
ہم دونوں
یوں وقت گزاریں
میں تم کو کچھ خواب دکھاؤں
تم مجھ کو کچھ خواب دکھاؤ
جن کی
کوئی تعبیر نہیں ہو
جتنے دن یہ میل رہے گا
دیکھو اچھا کھیل رہے گا

اور
کبھی دل بھر جائے تو
کہہ دینا تم
بیت گیا ملنے کا موسم

آؤ

اور نہ سوچو

سوچ کے کیا پاؤ گے

تمہیں بھی یاد نہیں اور میں بھی بھول گیا
وہ لمحہ کتنا حسین تھا مگر فضول گیا

میرے دل میں اُتر گیا سورج
تیرگی میں بکھر گیا سورج

درس دیکر ہمیں اُجالے کا
خود اندھیرے کے گھر گیا سورج

ہم سے وعدہ تھا اک سویرے کا
ہائے کیسا مکر گیا سورج

چاندنی عکس چاند آئینہ
آئینے میں سنور گیا سورج

ڈوبتے وقت زرد تھا اتنا
لوگ سمجھے کہ مر گیا سورج

تھکن سے چُور پاس آیا تھا اِس کے
گرا سوتے میں مجھ پر یہ شجر کیوں

وقت

یہ وقت کیا ہے
یہ کیا ہے آخر کہ جو مسلسل گزر رہا ہے
یہ جب نہ گزرا تھا
تب کہاں تھا
کہیں تو ہوگا
گزر گیا ہے
تو اب کہاں ہے
کہیں تو ہوگا

کہاں سے آیا کدھر گیا ہے
یہ کب سے کب تک کا سلسلہ ہے
یہ وقت کیا ہے

یہ واقعے
حادثے
تصادم
ہر ایک غم
اور ہر اک مسرت
ہر اک اذیت
ہر ایک لذّت
ہر اک تبسم
ہر ایک آنسو
ہر ایک نغمہ
ہر ایک خوشبو
وہ زخم کا درد ہو
کہ وہ لمس کا ہو جادو

خود اپنی آواز ہو کہ ماحول کی صدائیں
یہ ذہن میں بنتی اور بگڑتی ہوئی فضائیں
وہ فکر میں آئے زلزلے ہوں کہ دل کی ہلچل

تمام احساس

سارے جذبے

یہ جیسے پتے ہیں
بہتے پانی کی سطح پر

جیسے تیرتے ہیں
ابھی یہاں ہیں
ابھی وہاں ہیں

اور اب ہیں اوجھل
دکھائی دیتا نہیں ہے لیکن

یہ کچھ تو ہے
جو کہ بہہ رہا ہے
یہ کیسا دریا ہے
کن پہاڑوں سے آ رہا ہے
یہ کس سمندر کو جا رہا ہے

یہ وقت کیا ہے

کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں
کہ چلتی گاڑی سے پیڑ دیکھو
تو ایسا لگتا ہے
دوسری سمت جا رہے ہیں
مگر حقیقت میں
پیڑ اپنی جگہ کھڑے ہیں
تو کیا یہ ممکن ہے
ساری صدیاں
قطار اندر قطار اپنی جگہ کھڑی ہوں
یہ وقت ساکت ہو
اور ہم ہی گزر رہے ہوں
اِس ایک لمحے میں
سارے لمحے
تمام صدیاں چھپی ہوئی ہوں
نہ کوئی آئندہ

زِ گذشتہ

جو ہو چکا ہے

وہ ہو رہا ہے

جو ہونے والا ہے

ہو رہا ہے

میں سوچتا ہوں

کہ کیا یہ ممکن ہے

سچ یہ ہو

کہ سفر میں ہم ہیں

گزرتے ہم ہیں

جسے سمجھتے ہیں ہم

گزرتا ہے

وہ تھما ہے

گزرتا ہے یا تھما ہوا ہے

اکائی ہے یا بٹا ہوا ہے

ہے منجمد

یا پگھل رہا ہے

کسے خبر ہے
کسے پتا ہے
یہ وقت کیا ہے

یہ کائناتِ عظیم
لگتا ہے
اپنی عظمت سے
آج بھی مطمئن نہیں ہے
کہ لمحہ لمحہ
وسیع تر اور وسیع تر ہوتی جا رہی ہے
یہ اپنی بانہیں پسارتی ہے
یہ کہکشاؤں کی انگلیوں سے
نئے خلاؤں کو چھو رہی ہے
اگر یہ سچ ہے
تو ہر تصور کی حد سے باہر
مگر کہیں پر
یقیناً ایسا کوئی خلاء ہے

کہ جس کو
اِن کہکشاؤں کی انگلیوں نے
اب تک چھوا نہیں ہے
خلا
جہاں کچھ ہُوا نہیں ہے
خلا
کہ جس نے کسی سے بھی "کن" سنا نہیں ہے
جہاں ابھی تک خدا نہیں ہے
وہاں
کوئی وقت بھی نہ ہوگا
یہ کائناتِ عظیم
اک دن
چھوئے گی
اس ان چھوئے خلا کو
اور اپنے سارے وجود سے
جب پکارے گی
"کن"

تو وقت کو بھی جنم لے گا
اگر جنم ہے تو موت بھی ہے
میں سوچتا ہوں
یہ سچ نہیں ہے
کہ وقت کی کوئی ابتدا ہے نہ انتہا ہے
یہ ڈور لمبی بہت ہے
لیکن
کہیں تو اِس ڈور کا سرا ہے
ابھی یہ انساں الجھ رہا ہے
کہ وقت کے اِس قفس میں
پیدا ہوا
یہیں وہ پلا بڑھا ہے
مگر اُسے علم ہو گیا ہے
کہ وقت کے اِس قفس سے باہر بھی اک فضا ہے
تو سوچتا ہے
وہ پوچھتا ہے
یہ وقت کیا ہے

درد کے پھول بھی کھلتے ہیں بکھر جاتے ہیں
زخم کیسے بھی ہوں' کچھ روز میں بھر جاتے ہیں

راستہ روکے کھڑی ہے یہی الجھن کب سے
کوئی پوچھے تو کہیں کیا کہ کدھر جاتے ہیں

چھت کی کڑیوں سے اترتے ہیں مرے خواب مگر
میری دیواروں سے ٹکرا کے بکھر جاتے ہیں

نرم الفاظ، بھلی باتیں، مہذّب لہجے
پہلی بارش ہی میں یہ رنگ اُتر جاتے ہیں

اُس دریچے میں بھی اب کوئی نہیں اور ہم بھی
سر جُھکائے ہوئے چُپ چاپ گزر جاتے ہیں

اُن سے اب واپس خریدوں خود کو میں
لوگ جو مانگیں وہ اپنے دام دُوں

مجھ کو یقیں ہے سچ کہتی تھیں جو بھی امی کہتی تھیں
جب میرے بچپن کے دن تھے چاند میں پریاں رہتی تھیں

ایک یہ دن جب اپنوں نے بھی ہم سے ناطہ توڑ لیا
ایک وہ دن جب پیڑ کی شاخیں بوجھ ہمارا سہتی تھیں

ایک یہ دن جب ساری سڑکیں روٹھی روٹھی لگتی ہیں
ایک وہ دن جب "آؤ کھیلیں" ساری گلیاں کہتی تھیں

ایک یہ دن جب جاگی راتیں دیواروں کو تکتی ہیں
ایک وہ دن جب شاموں کی بھی پلکیں بوجھل رہتی تھیں

ایک یہ دن جب ذہن میں ساری عیّاری کی باتیں ہیں
ایک وہ دن جب دل میں بھولی بھالی باتیں رہتی تھیں

ایک یہ دن جب لاکھوں غم اور کال پڑا ہے آنسو کا
ایک وہ دن جب ایک ذرا سی بات پہ ندیاں بہتی تھیں

ایک یہ گھر جس گھر میں میرا ساز و ساماں رہتا ہے
ایک وہ گھر جس گھر میں میری بوڑھی نانی رہتی تھیں

دوراہا

اپنی بیٹی زویا کے نام

یہ جیون اک راہ نہیں
اک دوراہا ہے
پہلا رستہ
بہت سہل ہے
اِس میں کوئی موڑ نہیں ہے

یہ رستہ
اِس دنیا سے بے جوڑ نہیں ہے
اِس رستے پر ملتے ہیں

ریتوں کے آنگن
اِس رستے پر ملتے ہیں
رشتوں کے بندھن
اِس رَستے پر چلنے والے
کہنے کو سب سکھ پاتے ہیں
لیکن
ٹکڑے ٹکڑے ہو کر
سب رشتوں میں بٹ جاتے ہیں
اپنے پلّے کچھ نہیں بچتا
بچتی ہے
بے نام سی الجھن
بچتا ہے
سانسوں کا ایندھن
جس میں اُنکی اپنی ہر پہچان
اور اُنکے سارے سپنے
جل بجھتے ہیں
اِس رستے پر چلنے والے

خود کو کھو کر جگ پاتے ہیں
اوپر اوپر تو جیتے ہیں
اندر اندر مر جاتے ہیں

دوسرا رستہ
بہت کٹھن ہے
اس رستے میں
کوئی کسی کے ساتھ نہیں ہے
کوئی سہارا دینے والا ہاتھ نہیں ہے
اس رستے میں
دھوپ ہے
کوئی چھاؤں نہیں ہے
جہاں تسلی بھیک میں دیدے کوئی کسی کو
اس رستے میں
ایسا کوئی گاؤں نہیں ہے
یہ اُن لوگوں کا رستا ہے
جو خود اپنے تک جاتے ہیں

اپنے آپ کو جو پاتے ہیں
تم اِس رستے پر ہی چلنا
مجھے پتا ہے
یہ رستہ آسان نہیں ہے
لیکن مجھ کو یہ غم بھی ہے
تم کو اب تک
کیوں اپنی پہچان نہیں ہے

اِک کھلونا جوگی سے کھو گیا تھا بچپن میں
ڈھونڈتا پھرا اُس کو وہ نگر نگر تنہا

مری زندگی مری منزلیں، مجھے قُرب میں نہیں، دور دے
مجھے تو دکھا وہی راستا، جو سفر کے بعد غرور دے

وہی جذبہ دے جو شدید ہو، ہو خوشی تو جیسے کہ عید ہو
کبھی غم ملے تو بلا کا ہو، مجھے وہ بھی ایک سرور دے

تُو غلط نہ سمجھے تو میں کہوں ترا شکریہ کہ دیا سکوں
جو بڑھے تو بڑھ کے بنے جنوں مجھے وہ خلش بھی ضرور دے

مجھے تو نے کی ہے عطا زباں، مجھے غم سنانے کا غم کہاں
رہے ان کہی مری داستاں، مجھے نطق پر وہ عبور دے

یہ جو زلف تیری الجھ گئی، وہ جو تھی کبھی تیری دھج گئی
میں تجھے سنواروں گا زندگی، مرے ہاتھ میں یہ امور دے

آگہی سے ملی ہے تنہائی
آ مری جان مجھ کو دھوکا دے

کن لفظوں میں اتنی کڑوی اتنی کسیلی بات لکھوں
شعر کی میں تہذیب نبا ہوں یا اپنے حالات لکھوں

غم نہیں لکھوں کیا میں غم کو جشن لکھوں کیا ماتم کو
جو دیکھے ہیں میں نے جنازے کیا ان کو بارات لکھوں

کیسے لکھوں میں چاند کے قصّے کیسے لکھوں میں پھول کی بات
ریت اُڑائے گرم ہوا تو کیسے میں برسات لکھوں

کس کس کی آنکھوں میں دیکھے میں نے زہر بجھے خنجر
خود سے بھی جو میں نے چھپائے کیسے وہ صدمات لکھوں

تخت کی خواہش لوٹ کی لالچ کمزوروں پر ظلم کا شوق
لیکن اُن کا فرمانا ہے میں اِن کو جذبات لکھوں

قاتل بھی مقتول بھی دونوں نام خدا کا لیتے تھے
کوئی خدا ہے تو وہ کہاں تھا میری کیا اوقات لکھوں

اپنی اپنی تاریکی کو لوگ اُجالا کہتے ہیں
تاریکی کے نام لکھوں تو قومیں فرقے ذات لکھوں

جانے یہ کیسا دور ہے جس میں یہ جرأت بھی مشکل ہے
دن ہو اگر تو اسکو لکھوں دن رات اگر ہو رات لکھوں

صبح کی گوری

رات کی کالی چادر اوڑھے
مُنہ کو لپیٹے
سوئی ہے کب سے
روٹھ کے سب سے
صبح کی گوری
آنکھ نہ کھولے
منہ سے نہ بولے
جب سے کسی نے

کر لی ہے سورج کی چوری
آؤ
چل کے سورج ڈھونڈیں
اور نہ ملے تو
کرن کرن پھر جمع کریں ہم
اور اک سورج نیا بنائیں
سوئی ہے کب سے
روٹھ کے سب سے
صبح کی گوری
اُسے جگائیں
اُسے منائیں

مری دُعا ہے

خلا کے گہرے سمندروں میں
اگر کہیں کوئی ہے جزیرہ
جہاں کوئی سانس لے رہا ہے
جہاں کوئی دل دھڑک رہا ہے
جہاں ذہانت نے علم کا جام پی لیا ہے
جہاں کے باسی
خلا کے گہرے سمندروں میں
اتارنے کو ہیں اپنے بیڑے

تلاش کرنے کوئی جزیرہ
جہاں کوئی سانس لے رہا ہے
جہاں کوئی دل دھڑک رہا ہے
مری دعا ہے
کہ اس جزیرے میں رہنے والوں کے جسم کا رنگ
اس جزیرے کے رہنے والوں کے جسم کے جتنے رنگ ہیں
اُن سے مختلف ہو
بدن کی ہیئت بھی مختلف
اور شکل و صورت بھی مختلف ہو
مری دعا ہے
اگر ہے اُن کا بھی کوئی مذہب
تو اس جزیرے کے مذہبوں سے وہ مختلف ہو
مری دعا ہے
کہ اس جزیرے کی سب زبانوں سے مختلف ہو زبان اُن کی
مری دعا ہے
خلا کے گہرے سمندروں سے گزر کے
اک دن

اُس اجنبی نسل کے جہازی
خلائی بیڑے میں
اِس جزیرے تک آئیں
ہم اُنکے میزباں ہوں
ہم اُنکو حیرت سے دیکھتے ہوں
وہ پاس آکر
ہمیں اشاروں سے یہ بتائیں
کہ اُن سے ہم اتنے مختلف ہیں
کہ اُنکو لگتا ہے
اِس جزیرے کے رہنے والے
سب ایک سے ہیں
مری دعا ہے
کہ اِس جزیرے کے رہنے والے
اُس اجنبی نسل کے کہے کا یقین کرلیں

دکھ کے جنگل میں پھرتے ہیں کب سے مارے مارے لوگ
جو ہوتا ہے سہہ لیتے ہیں کیسے ہیں بے چارے لوگ

جیون جیون ہم نے جگ میں کھیل یہی ہوتے دیکھا
دھیرے دھیرے جیتی دنیا دھیرے دھیرے ہارے لوگ

وقت سنگھاسن پر بیٹھا ہے اپنے راگ سناتا ہے
سنگت دینے کو پاتے ہیں سانسوں کے اکتارے لوگ

نیکی اک دن کام آتی ہے ہم کو کیا سمجھاتے ہو
ہم نے بے بس مرتے دیکھے کیسے پیارے پیارے لوگ

اس نگری میں کیوں ملتی ہے روٹی سپنوں کے بدلے
جن کی نگری ہے وہ جانیں ہم ٹھہرے بنجارے لوگ

رات سر پر ہے اور سفر باقی
ہم کو چلنا ذرا سویرے تھا

بہانہ ڈھونڈتے رہتے ہیں کوئی رونے کا
ہمیں یہ شوق ہے کیا آستیں بھگونے کا

اگر پلک پہ ہے موتی تو یہ نہیں کافی
ہنر بھی چاہیئے الفاظ میں پرونے کا

جو فصلِ خواب کی تیار ہے تو یہ جانو
کہ وقت آگیا پھر درد کوئی بونے کا

یہ زندگی بھی عجب کاروبار ہے کہ مجھے
خوشی ہے پانے کی کوئی نہ رنج کھونے کا

ہے پاش پاش مگر پھر بھی مسکراتا ہے
وہ چہرہ جیسے ہو ٹوٹے ہوئے کھلونے کا

سب ہوائیں لے گیا میرے سمندر کی کوئی
اور مجھ کو ایک کشتی بادبانی دے گیا

جرم اور سزا

ہاں گنہ گار ہوں میں
جو سزا چاہے عدالت دیدے
آپکے سامنے سرکار ہوں میں
مجھ کو اقرار
کہ میں نے اک دن
خود کو نیلام کیا
اور راضی بہ رضا
سرِ بازار، سرِ عام کیا

مجھ کو قیمت بھی بہت خوب ملی تھی لیکن
میں نے سودے میں خیانت کر لی
یعنی
کچھ خواب بچا کر رکھے
میں نے سوچا تھا
کے فرصت ہے
جو مری رُوح مرے دل کی تلاشی لے گا
میں نے سوچا تھا
کے ہو گی خبر
کتنا نادان تھا میں
خواب
چھپ سکتے ہیں کیا
روشنی
مٹھی میں رک سکتی ہے کیا
وہ جو ہونا تھا
ہوا
آپکے سامنے سرکار ہوں میں

جو سزا چاہے عدالت دیدے
فیصلہ سننے کو تیار ہوں میں
ہاں گنہ گار ہوں میں

فیصلہ یہ ہے عدالت کا
ترے سارے خواب
آج سے تیرے نہیں ہیں مجرم!
ذہن کے سارے سفر
اور ترے دل کی پرواز
جسم میں بہتے لہو کے نغمے
روح کا ساز
سماعت۔ آواز
آج سے تیرے نہیں ہیں مجرم!

وصل کی ساری حدیثیں
غمِ ہجراں کی کتاب
تیری یادوں کے گلاب

تیرا احساس
تری فکر و نظر
تیری سب ساعتیں
سب لمحے ترے
روز و شب شام و سحر
آج سے تیرے نہیں ہیں مجرم!
یہ تو انصاف ہوا تیرے خریداروں سے
اور اب تیری سزا
تجھے مرنے کی اجازت نہیں
جینا ہوگا

پہلے بھی کچھ لوگوں نے جَو بو کر گیہوں چاہا تھا
ہم بھی اس اُمید میں ہیں لیکن کب ایسا ہوتا ہے

چار قطعات

کتھئی آنکھوں والی اک لڑکی
ایک ہی بات پر بگڑتی ہے
تم مجھے کیوں نہیں ملے پہلے
روز یہ کہہ کے مجھ سے لڑتی ہے

لاکھ ہوں ہم میں پیار کی باتیں
یہ لڑائی ہمیشہ چلتی ہے
اُس کے اک دوست سے میں جلتا ہوں
میری اک دوست سے وہ جلتی ہے

پاس آکے بھی فاصلے کیوں ہیں
راز کیا ہے سمجھ میں یہ آیا
اُس کو بھی یاد ہے کوئی اب تک
میں بھی تم کو بھلا نہیں پایا

ہم بھی کافی تیز تھے پہلے
وہ بھی تھی عیّار بہت
پہلے دونوں کھیل رہے تھے
لیکن اب ہے پیار بہت

ہل اسٹیشن

گھل رہا ہے سارا منظر شام دھندلی ہوگئی
چاندنی کی چادر اوڑھے ہر پہاڑی سوگئی

وادیوں میں پیڑ ہیں اب نیلگوں پرچھائیاں
اٹھ رہا ہے کہرا جیسے چاندنی کا ہو دھواں

چاند پگھلا تو چٹانیں بھی ملائم ہوگئیں
رات کی سانسیں جو مہکیں اور مدھم ہوگئیں

نرم ہے جتنی ہوا اتنی فضا خاموش ہے
ٹہنیوں پر اوس پی کے ہر کلی بے ہوش ہے

موڑ پر کروٹ لئے اب اونگھتے ہیں راستے
دور کوئی گا رہا ہے جانے کس کے واسطے

یہ سکوں میں کھوئی وادی نور کی جاگیر ہے
دودھیا پردے کے پیچھے سرمئی تصویر ہے

ڈھل گئی ہے روح لیکن دل کو یہ احساس ہے
یہ سکوں بس چند لمحوں کو ہی میرے پاس ہے

فاصلوں کی گرد میں یہ سادگی کھو جائے گی
شہر جاکر زندگی پھر شہر کی ہو جائے گی

بے گھر

شام ہونے کو ہے
لال سورج سمندر میں کھونے کو ہے
اور اُس کے پرے
کچھ پرندے
قطاریں بنائے
اُنہیں جنگلوں کو چلے
جن کے پیڑوں کی شاخوں پہ ہیں گھونسلے
یہ پرندے

وہیں لوٹ کر جائیں گے
اور سو جائیں گے
ہم ہی حیران ہیں
اس مکانوں کے جنگل میں
اپنا کہیں بھی ٹھکانا نہیں
شام ہونے کو ہے
ہم کہاں جائیں گے